دریچے

ظفر قریشی دہلوی

(زمانۂ جنگ کا اڈیشن)

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

قیمت دو روپے

بار اوّل

کہنے کی بات

"گذرگاہِ خیال" کی اشاعت کے بعد مسٹر ظفر قریشی کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ "دریچے" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ میں ظفر صاحب کے صرف وہ افسانے شریک ہیں جو اُن کی نگارشِ جدید کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان افسانوں کے دیکھنے سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ افسانہ نگار کے فن میں کس قدر پختگی آ گئی ہے۔ ان افسانوں کو اگر "تجزیاتی مطالعے" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اِن افسانوں کی ایک اور خصوصیت بھی ہے ـــ پُرخلوص بیباکی۔ جو ہمت مردانہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جو نتیجہ ہو جراُتِ رندانہ کا۔ اس لحاظ سے یہ افسانے ہمارے افسانوں میں ایک خوشگوار اضافہ سمجھے جائیں گے اور اُمید ہے کہ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

شاہد احمد دہلوی

فہرس

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ
(۱)	جب کوئلیں چلا رہی تھیں	(۵)
(۲)	کاخ بلند	(۱۹)
(۳)	وہ ایک کسبی تھی	(۲۸)
(۴)	ایک ہنٹر تھا	(۴۸)
(۵)	پہلی شب	(۵۹)
(۶)	چند لمحے	(۶۶)
(۷)	کیا تمہیں یاد ہے	(۸۶)
(۸)	ہم تینوں	(۱۰۲)
(۹)	شکار یزداں	(۱۴۱)
(۱۰)	جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا	(۱۷۰)
(۱۱)	ایک تھا اناڑی نسرد	(۱۸۳)
(۱۲)	میرے جیون کا اندھیارا	(۱۹۷)

جب کوئلیں چلّا رہی تھیں

(عنوان کے مکرر استعمال کیلئے محترمہ حجاب امتیاز علی سے معذرت کے ساتھ)

"تم کس قدر حسین لڑکے ہو!"

موجودہ دنیا کی تاریخ و تمدّن کے اُستاد کی بیوی نے اپنے شوہر کے سب سے کمسن شاگرد سے کہا۔

بظاہر یہ رسمی اور کسی قدر بے نمک توصیف تھی جو "اس قدر حسین" لڑکے نے سُنی۔ وہ کئی بار اس قسم کی تعریف اپنے اُستاد کے مُنہ سے بھی سُن چکا تھا۔ وہ اُن چھ خوش قسمت شاگردوں میں سے تھا جو ہسٹری کے پروفیسر کے مکان پر پرائیویٹ ٹیوشن کیلئے اُستاد نے منتخب کئے تھے۔

پروفیسر کی بیوی اور کمسن شاگرد کے درمیان اگر کوئی باہمی ربط کی چیز تھی تو وہ صرف جسمانی کشش تھی جسے وہ بخوبی جانتے تھے اور شروع سے ہی یہ بات محسوس کر لی گئی تھی۔ ان کا عشق بہت ہی سلیس اور غیر رسمی تھا، سیدھا سادا دل کا معاملہ تھا۔ آہ و فغاں اور ہجر و وصال وغیرہ کی دقیانوسی باتوں سے تاریخ و تمدّنِ جدید کے پروفیسر کی بیوی

اور اس کا شاگرد قطعی نا آشنا تھے: سادگی، معاملات، نے گفتگو میں بھی اختصار پیدا کر دیا تھا۔

پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ واقعی یہ لڑکا ایک جمیل و نازک بچہ تھا۔ سولہ سترہ سال کا رسیلا موسمی پھل! ابھی ابھی اس نے پہلی مرتبہ تاریخ جدید کے پروفیسر کی بیوی کے رخسار کو بوسہ دیا تھا۔ سحاب محبت سے گرا ہوا پہلا قطرۂ نیساں جس کے لئے تشنہ لب صدف سیمیں (سنا ہی) عرصہ سے منہ کھولے بیٹھی رہتی ہے۔ صحرائے "گوبی" کی طرح صاف و بے گیاہ اور جاندار سیب کی طرح نرم و تمناک رخسار جب پروفیسر کی بیوی کے رخساروں سے مس ہوئے تو متمدن بیوی نے محسوس کیا کہ اس لطیف سطح کو ہفتہ میں دو روز سے زیادہ "شیو" کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہوگی!

آموں کے جھنڈ پر چاند کھل رہا ہے اور دونوں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہیں۔ لڑکے کا ہاتھ اپنی محبوبہ کی کمر کے گرد ہے۔ بہت دیر تک دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے رہے۔ اب وہ ذرا گرفت کو ڈھیلا کر رہے تھے، تاکہ پے بہ پے بوسوں اور ربلے کے انبساط سے ان کا تنفس جو بوئے گل کی طرح پریشان ہو چکا ہے پھر معمول پر آجائے۔ پرشوق مسافر جلد منزل پر پہنچنے کیلئے تیز رو ہو جاتے ہیں مگر جب سانس چڑھ جاتا ہے تو انہیں ذرا ٹھہرنا ہی پڑتا ہے۔

پروفیسر کی بیوی کیلئے بچے اغوا کرنے کا یہ پہلا تجربہ ہے اور شاید

اسی وجہ سے وہ ذرا مضطرب سی ہے۔ اور جہاں تک اُسے معلوم ہے، لڑکے کیلئے بھی یہ اُسکی عمر کا پہلا سانحہ عشق ہے۔

اُکتا دینے والی خاموشی کو توڑنے کیلئے آخر کار پروفیسر کی بیوی کو ہی کوشش کرنی پڑی۔

"آخر کب تک چُپ رہو گے ـــــ یہ جگہ کچھ زیادہ گیلی تو نہیں ہے ـــ بیٹھ جائیں؟"

جدید تاریخ کے نوعمر متعلّم کو بتایا گیا تھا کہ قول کے مقابلہ پر عمل کو ترجیح دینے سے اقوامِ عالم نے ترقی کی ہے اس لئے وہ جواب میں زمین پر دراز ہو گیا۔ پیڑ سے پُشت لگا کر۔ بے سہارا زندگی بھی کس کام کی۔

اُستاد کی بیوی بھی لمبی گھاس کو ایک طرف سرکاتے ہوئے اُس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ کچھ لجائی ہوئی سی ـــــ نوعمر لڑکوں کو ورغلانے والی عورتوں سے زیادہ کوئی مخلوق شرمیلی نہیں ہوتی ـــــ ہر چند کہ وہ لڑکے کی طرف دیکھنا نہ چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ دیکھنے ہی لگی اور دیکھتی ہی رہی حتیٰ کہ شرم نے آنکھیں بند اور شوق نے ہاتھ دراز کر دئے۔

دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے آموں کے نیچے لیٹے رہے۔ چاند کبھی بدلی میں چھپتا تھا اور کبھی روشن و منوّر مینائے سرجوش چھلکاتا ہوا ان متوالوں کے حضور جھک جاتا تھا، پر جو نہی

یہ اس میہ ذائے تابناک کی طرف لب گستاخ بڑھاتے عصمت گیتی کے پاسبان بادل آتے پھر اپنے ستر میں چھپا کر غائب کر دیتے۔ ان مختصر لمحوں میں ہنسی کی چند لطیف جھنکاروں اور غنچہ ریز بوسوں کی گونج کے سوا فضا میں اور کچھ سنائی نہ دیتا۔

اچانک، باغ میں کوئلوں کا شور ہوا۔ ایک درد مند کوئل عین اُن کے سر پر چیخی۔

پروفیسر کی بیوی نہ کیوں گنگنانے لگی:۔

"امبوا کی ڈار کوئیلیا بولے"

"بن میں بولے، مور ــــ پپیہا ــــ"

"ساجن کیوں نہیں آئے رین"

ساجن کو اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب پاکر متمدن بیوی نے اٹھلا کر پوچھا:۔

"تمہیں تو میرا اصلی نام تک معلوم نہیں۔ بھلا تم مجھ سے پوچھتے ہی کیوں۔ اس میں شاید تمہاری شان گھٹ جاتی"!

"نہیں، بھلا یہ خیال کیسا۔ کیا تم مجھے ایسا سطحی آدمی سمجھتی ہو ــــ!"

"تو پھر تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا کہ میرا نام کیا ہے؟"

"مسز آندر۔ بس اور کیا!"

"لیکن یہ تو ایسا نام ہے جو اونٹ کی نکیل کی طرح باندھنا ہی

پڑتا ہے۔ عام دیکھنے والے اُونٹ کم اور رسی زیادہ دیکھتے ہیں لیکن جنہیں خاص ربط ہوتا ہے وہ اُونٹ کی ناک بھی دیکھتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ میرا اپنا بھی ایک نام ہے۔ تم مجھے اُسی نام سے یاد کیا کرو۔ ہیں۔ نہ؟"

"ضرور، ضرور"

"تو پھر بتا دوں اپنا نام"

"اب بھی انتظار کراؤ گی۔ پریتی"

"ذرا پُرانی قسم کا نام ہے۔ شاید تم اُسے پسند کرو۔ اس وقت کوئل کے چیخنے سے مجھے اس کا دھیان آ گیا ـــ میرا ـــ ہاں میرا نام "کوکیلا" ہے"

"کوکیلا!"

"کیوں کیا ناپسند ہے؟ اگر ناپسند ہو تو بدل دو"

"نہیں پریتی یہ نام بڑا رومانٹک ہے۔ میرے دل کو بھاتا ہے"

چاند اور کئی سیڑھیاں اُوپر چڑھ گیا تھا۔ شاید گوشِ عرش میں کوئی پتے کی بات کہنے کے لئے ـــ مگر چاند تو امین راز ہے۔ کسی کا واقعۂ اُلفت اُس نے طشت از بام نہیں کیا۔ گو زمین پر بسنے والوں کے عشق کی نامرادیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا ننھا سا دل کڑھتے کڑھتے داغدار ضرور ہو گیا ہے۔

برساتی گھمس کی وجہ سے پیڑ کے پتے خاموش تھے۔ جیسے خلِ وِ ربار

میں حاجب و دربان مؤدب و دست بستہ احکام کے منتظر کھڑے ہوں۔

کوئل اپنی دردناک چیخیں سنائے جا رہی تھی۔

"اچھا اب تمہارا نام تو معلوم ہو گیا۔۔۔ کوکیلا۔۔۔ اُف" کسقدر سہانا نام ہے۔ اب کچھ اپنی زندگی کے دو چار راز اور بتاؤ۔ مجھے غیر نہ سمجھو۔ پروفیسر صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں، وہ مجھ پر کسی طرح کا گمان نہیں کر سکتے۔ وہ بہت چاہتے ہیں مجھے کوکیلا"

تاریخ حاضرہ کے پروفیسر کی بیوی نے کہا کہ کوئی خاص بات تو اس کی زندگی میں ایسی ہے نہیں جو بتائی جائے۔ سوائے اسکے کہ شوہر کی عمر اس سے کوئی پندرہ سال بڑی ہے۔ اِن دونوں کی ملاقات یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک ہاکی میچ کے وقت ہوئی۔ دونو نے ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور وہ اس طرح پیوست ہو گئے جیسے ایک برج میں دو سعد ستارے جمع ہو جائیں۔ مگر شادی کے بعد بہت جلد انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ٹوٹنے والے ستاروں کی مانند ہیں جو جلد ٹکرا کر ایک دوسرے سے، زمین پر آ رہیں گے۔

پروفیسر ایک خشک طبع، منطقی مزاج اور عالم قسم کا آدمی تھا۔ جسے کتابوں، لکچروں، لڑکوں اور یونیورسٹی کی دو چار لگی بندھی تقریبوں کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ کوکیلا پروفیسر کے

دوستوں اور اُن کی بیویوں کو اپنے ہاں چاء پر بُلاتے بُلاتے تھک گئی تھی۔ کالج کی سوشل سروس لیگ کی رکنیت سے وہ بہت عرصہ سے اُکتا چکی تھی۔ ان سب چیزوں میں اس کے دل بہلاؤ کا کوئی عنصر نہ تھا۔

پروفیسر کی بیوی نے برجیس (اس کا یہی نام تھا) کے قدرتی خوف کو ذرا کم کرنے کے لئے یہ بھی بتا دیا کہ اس سے قبل وہ اور کئی جگہ دل بہلا چکی ہے، اس لئے پس وپیش کا صحیح اندازہ ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بس اس سے زیادہ کو کیلا نے برجیس کو اور کوئی بات نہیں بتائی۔ ایسا کرنے سے چاندنی اور کوئل کی کوک کا پس منظر، بقول اسکے "اسپائل" ہو جاتا!۔

برجیس پوری سنجیدگی کے ساتھ عشق کے سمندر میں ــــ یہ نہ جانتے ہوئے کہ تیرنا کیا چیز ہے ــــ غوطے کھا رہا تھا اور ڈوبنے کی طرف سے بے فکر تھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ کو کیلا کی "لائف بیلٹ" اسے غرق نہیں ہونے دیگی۔ کاش جدید تاریخ کا کوئی پروفیسر یا کوئی نئی متمدن بیوی اسے سمجھا سکتے کہ تریاق کے بھروسے پر زہر کھانا دانشمندی نہیں ہے۔

"پروفیسر صاحب ہماری ملاقات پر ــــ میرا مطلب یہ ہے کہ ــــ غصّہ تو انہیں نہیں آئے گا۔ کلاس میں تو انہیں غصّہ کبھی نہیں آتا۔ گھر کا حال معلوم نہیں ہے"

سغقہ! ہاں کہہ لو ایسا کچھ بہت زیادہ غصہ بھی نہیں آتا، لیکن اس کی حالت کھسیانی بلی کی مانند ہے جو دودھ تک نہ پہونچنے پر اسے گرا دیتی ہو۔ ایسی ہی حالت اس کی بھی ہے۔ اوہ! اگر وہ مجھے اور تمہیں یہاں اس حالت میں دیکھ لے تو بس غضب ہی ہو جائے۔"

"غضب ہو جائے گا تو میں کیا کروں۔"

"ڈارلنگ تم کس قدر بچے ہو! بس اتنی سی بات میں ڈر گئے۔ بیشک وہ ذرا ظالم قسم کا آدمی ہو اور میرے چلن پر شبہ نہ کرتے ہوئے بھی متجسس نظر رکھتا ہو۔ خیر، احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"اس وقت بھلا آسے، کیا شبہ ہو سکتا ہے، تم تو ڈاکٹر ماتھر کی وائف کے ہاں آج مدعو ہونا۔ ایسی شہادت کی موجودگی میں بھلا کیا بدگمانی ہو سکتی ہے۔"

"بڑی اچھی لڑکی ہے مسز ماتھر، کبھی ملائیں گے تم سے، برجیس۔"

"پھر خاموشی چھا گئی۔ کوئل نے پھر کوکنا شروع کیا۔"

"پیاری کوکیلا ——— کوکیلا پیاری!" کہتے کہتے برجیس نے اپنے لمبے ہاتھ محبوبہ کی کمر کے گرد اس طرح ڈال دئے جیسے جنبیلی میں عشق پیچاں کی بیل الجھ جائے۔ بعض حلقے کس قدر دوامی اور بعض قیدیں، پُرمشقت ہونیکے باوجود کس قدر سُہانی ہوتی ہیں!۔

دوسرے روز صبح کو جب برجیس دیر سے اٹھا تو اس کا جسم

بادۂ شبانہ کی سرمستی سے چور چور تھا بڑی مشکل سے وہ کپڑے بدل کر باہر نکلا اور خیال آیا کہ چلتے چلتے اُسے کوکیلا نے یاد دلایا تھا کہ ٹیلیفون کر کے وقت لے لینا۔

ہوسٹل سے نکل کر اسٹیشن کے پبلک ٹیلیفون پر پہونچکر اُس نے جیبیں تلاش کرنی شروع کیں اور کس قدر ستم ہے کہ خود بردفلیبر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ٹیلیفون نمبر نکل آیا جو اُس نے بر جیس کو فسٹ ایر میں آنے کے دو روز بعد ایک پرانے لفافے پر پنسل سے گھسیٹ کر دیدیا تھا اور کہا تھا کہ " اگر کوئی ضروری کام ہو تو اس نمبر پر " رنگ " کرنا " اُسے یہ معلوم کر کے کس قدر اطمینان ہوا کہ " رنگ " کا جواب کوکیلا کی سریلی آواز نے دیا۔

" ہیلو کوکیلا ؟ کیسی ہو میری پریتی ؟ "

" سنو ! بر جیس ! " اس کی آواز ذرا سنجیدہ سی تھی۔ کچھ خوفزدہ سی " میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتی۔ ابھی ابھی وہ گیرج کی طرف گئے ہیں، لیکن شاید پھر واپس آئیں۔ تم ابھی ایک دو روز تک نہ میرے پاس آنا اور نہ فون کرنا ــــ سمجھے نا ــــ میں خود تمہیں فون کروں گی۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے، مجھے کچھ ایسا یقین سا ہو رہا ہے کہ اس کو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

" ارے ! تو غضب ہی ہوگیا ! "

برجیس نے محسوس کیا کہ اُسے ایک منٹ کی دق ہو گئی ہے اور جسم کا سارا خون سوکھ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آنے والے واقعات کی ایک بھیانک تصویر کھنچ گئی۔ جب اس کا باپ سُنے گا تو دوڑا ہوا آئے گا اور اسٹیشن سے اتر کر سیدھا کالج کے ہوسٹل کا رُخ کرے گا۔ ملتے ہی جھلائے گا: "ارے برجی! یہ تو نے کیا غضب کیا۔ نالائق تو نے سادات کی عزت خاک میں ملا دی۔ خاندان کو بے آبرو کر دیا۔ اب یونیورسٹی سے نکالا جائیگا" برجیس سوچ رہا تھا کہ اس کا باپ یونیورسٹی سے خارج شدہ بیٹے کو لیکر جب گھر پہونچے گا تو ماں روتے روتے اپنا بُرا حال کر چکی ہوگی! یا خدا یہ کیا ہو گیا!

"برجیس، ممکن ہے یہ سب میرا واہمہ ہو۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ اُسے شبہ ہے اور ہے تو پتہ کیسے چلا۔ لیکن آج صبح وہ کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ چاء پی کر اخبار دیکھنے لگا۔ پھر چہرے پر اخبار کرکے مجھ سے کہنے لگا: میری پیاری! تم بُرا نہ ماننا۔ ایک چیز میں اپنے گھر میں ہرگز نہیں دیکھ سکتا اور وہ ایک ایسی ہستی کی موجودگی ہے جو بچّوں کو ورغلائے یا اغوا کرے۔ بچّے —— خاص کر بڑے بچّے۔ ہماری مقدس امانت ہوتے ہیں اور انہیں اچھی طرح رکھنا اور خرچ نہ ہونے دینا ہمارا فرض ہے —— خیر، اب تو میں جا رہا ہوں۔ گاڑی نکالوں جا کر —— پھر مفصل بات کرونگا" —— تو بس اتنی بات ہوئی ہے۔ پتہ نہیں آخر معاملہ کیا ہے —— اور لو —— ہاں! —— ایک بات اور یاد آئی۔ ذرا

"مہتاب باغ" کی طرف پھر جانا. میں وہاں اپنا ہینڈ بیگ رات کو چھوڑ آئی ہوں، وہ اگر مل جائے تو ضرور اپنے پاس رکھ لینا. پیارے برجیس! کیا تم یہ تکلیف میرے لئے کر دگے. آج اور ابھی ابھی جاؤ ورنہ پھر وہ نہ ملے گا اور اس کا ملنا ازحد ضروری ہے. میں جب ملوں گی تم سے لے لوں گی. اچھا اب رخصت لو، وہ پروفیسر تاریخ آرہا ہے! برجیس خیال رہے کہ جب تک میں اطلاع نہ دوں تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا ــــ اچھا کیا تم نے مجھے "رِنگ" کر دیا. میرے دل سے ایک بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ــــ اچھا ڈارلنگ ..... "چیریو!"

برجیس اس جگہ گیا جہاں رات کو وہ آموں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے. کون ہو سکتا ہے جس نے پروفیسر کو اس کے خلاف رپورٹ دی ہو. ممکن ہے اس کے کسی دوست نے اُسے سمجھایا ہو کہ تمہاری بیوی اکثر نوعمر انڈر گریجویٹ لڑکوں کی اپنے مکان پر ضرورت سے زیادہ خاطر تواضع کرتی ہے. اگر ایسا کسی نے کہا بھی تو کیا ہے. خاص اس کی ذات پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا. ابھی اُسے یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں. کوکیلا نے خوب اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ 'بس' میں کوئی ان کا جاننے والا تو نہیں تھا. اور اگر کسی نے دیکھا بھی تو بھلا رات کو دس گیارہ بجے یا صبح سویرے کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ایسی بات کرنے کیلئے پروفیسر کو فون

کرے گا. جہاں تک دنیا کے باقی لوگوں کا تعلق ہے وہ عمر اور صورت سے اس کا بھانجہ، بھتیجہ، لگتا تھا.

رہ گیا یہ امکان کہ رات کو آم کے پیڑ کے پیچھے پروفیسر تاریخ بیٹھا ہوا اُن کے عشق کا تماشہ دیکھتا رہا تھا اور صبح کو طنزاً اس نے اپنی بیوی کو "پیاری" کے لفظ سے خطاب کیا تھا، یہ سب خیال بالکل غلط تھے. پروفیسر کا اس دور دراز باغ تک بلاوجہ آنا بالکل ناقابل تسلیم ہے.

یہ سب باتیں سوچنے سے برجیس کا دل ذرا ٹھہر گیا.

جس درخت کے نیچے وہ لوگ رات کو جا کر بیٹھے تھے اُس کا معلوم کر لینا زیادہ دشوار نہ تھا. جھاڑیوں کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی بائیسکل پڑی ہوئی تھی. نہ جانے کون اُسے وہاں ڈال گیا تھا. حیران تھا کہ یہاں آئی کیسے. لیکن اس بائیسکل کی وجہ سے اُسے جگہ پہچاننے میں کتنی آسانی ہوئی. بائیسکلیں نہ ٹوٹیں تو لوگوں کو کس قدر تکلیف ہو جائے!

کوکیلا کا ہینڈ بیگ اس نے فوراً پڑا ہوا دیکھ لیا. وہ اُسے جھک کر اٹھا ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:-

"سلام ہجور!"

"سلام!"

برجیس گھبرا سا گیا.

سلام کرنے والے کا حلیہ چوکیدار کا سا تھا۔ مگر شکل سے وہ بھلا اور خوش مزاج سا دکھائی دیتا تھا ورنہ آموں کے رکھوالے میٹھے پھلوں کے درمیان رہنے کے باوجود بہت ترش اور کڑوے ثابت ہوتے ہیں ـــ!

"آج کا موسم صبح سے ہی اچھا ہے۔ شاید بارش پھر ہو"

"ہاں، واقعی۔ اچھا یہ تو بتاؤ میں بغیر اجازت اس باغ میں آ گیا ہوں کوئی منع تو نہیں کریگا؟"

"نہیں صاحب! آپ فکر نہ کریں یہاں تو اکثر شوقین لوگ سیر تفریح کے لئے آتے رہتے ہیں مگر ذرا دور جگہ ہے۔ کل شام کو بھی بہت سے بابو لوگ لاری میں آئے تھے اور یہاں، جہاں آپ کھڑے ہیں نا، وہ لوگ ریڈیو لگا کر چلے گئے۔ پھر ایک افسر آیا اس نے بھی وجلی سی لگائی۔ میں سمجھا آپ بھی شاید ریڈیو دیکھنے آئے ہیں:

برجیس نے اشارے کی طرف غور کر کے دیکھا تو آم کے جھنڈ میں ایک شاخ پر لٹے۔ آئی۔ آر۔ چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک جگہ آم کی شاخ میں مائیکروفون بھی لٹک رہا تھا۔

"یہ سب صاحب! یہ ـــ پتہ نہیں اسے کیا کہہ رہے تھے وہ ـــ اکڑفون یا مکڑفون! رات سے یہ لٹک رہا ہے۔ کوئلیں یہاں بہت بولتی ہیں صاحب۔ ان کی آواز ریڈیو والے لینے آئے تھے ـــ میں نے تو اندر کوٹھی میں، جب کرنل سردار جی کہنے لگے

کہ اتنی صاف آواز آ رہی ہے کہ جیسے کو میں ریڈیو ہی میں بیٹھی کوک رہی ہوں۔ اور پھر اردگرد کی آوازیں جیسے جھینگروں کی، مینڈکوں کی؛ اور نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ آوازیں ملی جلی آ رہی تھیں۔ مجھے تو ایسا مزا آیا کہ برابر سنے گیا۔ کمال کر دیا ہے انگریزوں نے۔ بابو جی آپ نے بھی سنا تھا ریڈیو؟ ——— رات کو شاید آپ ریڈیو نہیں سنتے !“

کاخِ بلند

(ایک لطیف حکایت مگر دراز نہیں!)

نماز چاشت کا وقت تھا ۔۔۔!

نگار کے چہرے پر رات کی بیداری اور کسل مندی کے آثار پائے جاتے تھے. جیسے کسی بچے کے ملائم پیروں کی شوخی نے ریگِ دریا پر اپنے ننھے ننھے نشان دُور تک پھیلا دئے ہوں. ایک سفید ننھی سی بلاؤز کے نیچے اس کا چمکدار و مضطرب سینہ ابھی دھڑکتے دھڑکتے ذرا خاموش ہوا تھا.

کسی مرد کے اندر آ جانے سے اُسے یہ محسوس کرنا پڑتا تھا کہ اب دل کی حرکت تیز ہو جانی چاہیئے. مگر جب وہ باہر چلا جاتا تھا اور دروازہ بند ہونے کی آواز آتی تھی تو دل بھی ذرا ٹھہر جاتا تھا.

جونہی دراز قد آدمی کمرے کے باہر گیا اس کی جان میں جان آئی. وہ روز صبح کو اس کی چاء کی مانند آجایا کرتا تھا. آجاتا تھا اور پرستش کر کے چلا جاتا تھا. وہ اس بُتِ بیدادگر کو پوجتا تھا. اس نے خواہش کو پرستش قرار دے لیا تھا. احمق. لمبا آدمی احمق ہوتا ہی ہے. یہ دراز قد نگار

کو دُنیا کی عورتوں میں حسین ترین عورت سمجھتا تھا۔ وہ اُسے الہتہ الجمال
مانتا تھا۔ اس کی ہمت مردانہ کا اصول یہ تھا کہ نگار کے لبوں کا بوسہ
لینا تحریم عشق کے منافی ہے۔ بھلا نگار کے لب کوئی چُوم سکتا ہے! ایسا
غیر شاعرانہ تصوّر اُسے کبھی اپیل نہیں کرتا تھا۔ وہ دُور سے بیٹھ کر پرستش
کرتا تھا اور جب نگار اپنا ننھا سا گلابی ہاتھ مُنہ پر رکھ کر جمائی لیتی تو وہ
سمجھ جاتا کہ اب وہ اُسے کمرہ سے باہر دیکھنا چاہتی ہے! جس طرح وفادار
کتّا مالک کی مرضی پہچان کر دُم نیچی کر کے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے یہ
پرستار بھی اپنا مُنہ لٹکائے، نیچی نظریں کئے آستانۂ جمال کی سیڑھیوں
کو بوسہ دئے بغیر باہر چلا جاتا تھا۔

نماز عصر کا وقت تھا ــــ!
اس وقت نگار بجائے خود ایک مطالعۂ زرّیں بنی بیٹھی تھی۔ بھر
تا پا بنارسی جوڑے میں ملبوس بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر گلدستے پڑے
ہوئے تھے۔ ایک خوبصورت سی ننھی ڈبیہ میں مرصّع الماس کی
سارٹیی پن جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ اس کے پاس ایک
نازک گھڑی اپنے مخملی تکیہ سے کمر لگائے پڑی دھڑک رہی تھی۔
یہ سب تحفے کالج کا ایک امیر لڑکا لایا تھا۔ وہ ابھی نکل کر
باہر گیا تھا۔
نگار اُسے دیکھنے کیلئے اپنے فلیٹ کے بیرونی حصہ میں آگئی۔

وہ بازار میں جلدی جلدی قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ اُسے شاید کسی اور نگار کے پاس بھی جانا ہوگا۔ دیہات کے امیرزادے کالج میں رہ کر جب تک کئی جگہ تحفے نہ بانٹیں انہیں اپنی گرم محبت کا یقین نہیں ہوتا۔ دولت کے ٹکڑے جابجا بکھرے ہوئے ہوں تو وہ کہیں نہ کہیں سے "منافع" ضرور لیکر آتے ہیں!۔

نگار کو ایسے لڑکوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے اور وہ اُن نکمّے بیوقوں کو مادرانہ شفقت کے ساتھ ٹالنے میں بڑی حکمت سے کام لیتی ہے۔

یہ لڑکا بھی اُسے دل وجان سے چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تک میں نے کسی دیہاتی لڑکی کو بھی ایسا پسند نہیں کیا جیسا کہ آپ کو دیکھکر از خود رفتہ ہو گیا ہوں۔ نگار کو خوب معلوم ہے کہ آج کل کے یہ "گلفام شہزادے" موٹروں کی مانند ہوتے ہیں کبھی کسی جگہ قرار نہیں پاتے۔ اس لئے وہ سوچا کرتی تھی کہ ان سے تحفے لیکر دوسرے آنے والے مردوں کی آنکھیں خیرہ کرنے اور انہیں اُلو بنانے کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ ایک مرد کی حماقت سے دوسرے مرد کی حماقت کو دفع کردو۔ جب مرد ہے ہی اتنا بیوقوف تو عورتیں اپنی چالاکی کی شہرت کو جو بلا وجہ قائم ہوگئی ہے، کیوں ضائع کردیں!۔

نگار نے دیکھا کہ وہ بچہ ——— ہاں وہ بچہ ہی تھا ——— سترہ اٹھارہ سال کا خوبصورت دیہاتی امیرزادہ بھونرے میں پلا ہوا

لاڈلا۔ شہر میں آکر وہ اور بھی گھٹ گیا تھا۔۔۔۔ وہ بچہ چلا جا رہا تھا۔
نگار سوچتی کہ اس لڑکے میں غلامانہ عشق و پرستش کے کس قدر بلیغ
جذبات موجود ہیں۔ مگر نگار کو نہ "سنجیدہ مرد" کی عبودیت پسند تھی
نہ الھڑ لڑکوں کی خود فراموشی و غلامانہ بیتابی پسند تھی۔ یہ لڑکا نگار
کے لبوں کو محض اس لئے چومنا نہ چاہتا تھا کہ یہ مسرت بے پایاں مرد
کے عشق کی تمام آسودگیوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ جوشؔ کے "بیچے از
نازک اندامان کالج" کی اس بے بسی پر اُسے ہنسی آجاتی تھی۔ مگر
پھر وہ سوچتی تھی کہ غریب کیا کرے۔ کیٹس کا دلدادہ رومانی ابھی تک
اپنے آپ کو عہد وکٹوریہ میں لئے پھرتا ہے۔

دریچے میں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ نازک لڑکا اب دُور پہونچکر
ایک نقطۂ موہوم بن چکا تھا۔

نمازِ مغرب کا وقت تھا۔۔۔!

وہ بھی اپنے شہر کی نشر گاہ سے واپس آئی تھی۔ یہ لوگ نہ جانے
اس کو اس قدر تنگ کیوں کرتے ہیں۔ ہزاروں خط روزانہ اس
تاکید کے آتے ہیں کہ "نگار محل خاتون" سے ایک بار پھر "تلخابۂ شیریں"
میں پارٹ کرایا جائے۔ خدمتِ خلق کے جذبۂ معصوم سے وہ کس
طرح گریز کر سکتی تھی۔ آپ نے بہت سی امیر و شاندار عورتوں کو دیکھا
ہوگا کہ وہ شہر کی گندی بستیوں میں جا کر سوشل کام کرتی ہیں اور

بہت سے غلیظ کام اپنے ہاتھ سے کر کے "خدمت الناس" کی مسرت حاصل کرتی ہیں۔ نگار نے صوتی نشر کے ذریعہ "خدمت خلق" کو ہی اپنا مطمحِ نظر بنا لیا تھا مگر بعض اوچھے لوگ اسے بھی وسیلۂ تفریح بنانے سے نہ چوکے اور شیریں کلامی و زیبِ تکلم پر ہی مر مٹے۔

وہ ابھی اپنے شہر کی نشر گاہِ صوتی سے واپس آئی تھی۔

مخملیں کار میں کیسے یون میل کا ننھا سا سفر ایسا نڈھال کر دیتا تھا جیسے صحرائے اعظم میں کسی "ٹرک" ([illegible]) پر بیٹھ کر سفر کر کے آئی ہو۔

وہ آتے ہی اپنے صوفہ پر دراز ہو گئی۔

اوہ یہ مرد ـــــ پھر ایک مرد آ گیا۔ یہ صاحب بُری طرح اس کے عاشق تھے اور جب کبھی اس کی آواز فضا میں سُن لیتے تھے سگانہ وار اس کے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑتے تھے اور اپنے کلامِ رنگیں سے اس کا مزاج برہم کئے بغیر نہیں جاتے تھے۔ وہ کئی بار اُسے بتا چکی تھی کہ میں اپنے حُسن کی قصیدہ خوانی سنتے سنتے تنگ آ چکی ہوں۔ اُردو کے شعرا اور ادیبوں کی عبارت آرائی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان صاحب کو یہ بھی بتا چکی ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق چلنے میں یہ مان لیتی ہوں کہ میں [illegible] ہوں۔

آج بھی وہ کئی عمدہ عمدہ کتابیں اسے پڑھنے کے لئے دے گئے تھے۔ مگر اس کے پاس بڑے بڑے آدمیوں کے دل اور چھوٹے

چھوٹے مسخرے عشاق کے دماغ کے مطالعہ سے ہی فرصت نہ تھی کہ یہ سب انبار پڑھ سکتی.

یہ ادیب کہہ چکا تھا کہ عورت کے لبوں کا بوسہ سارے دماغی ادب کو زندگی کی قربانگاہ پر ذبح کر دینے کے برابر ہے. اسکی ترقی پسندی کی اصطلاح میں "جراتِ بیباک" کا مفہوم ابھی تک کہیں مرتب نہیں ہوا تھا. اس لئے اس نے کبھی نگار کے لبوں کی طرف دیکھا تک نہ تھا. وہ اس کعبۂ حسن کی چھت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا. اس نے سُنا تھا کہ ایسا کرنے سے اندھا ہو جانے کا احتمال ہے. پاسِ ادب یہی ہے کہ نظریں نیچی کئے "جی ہاں" "جی جی!" "صحیح فرمایا. جی جی" کہے جائے، اور اپنی تھکا دینے والی خاموشی سے دماغ چاٹ جائے. کسی کے مسلسل خاموش رہنے سے کس طرح "دماغ چاٹا" جا سکتا ہے. اس کی جہنمی اذیت شاید آپ کو نہیں پہنچی ہوگی. نگار جب اس "بے زبان حیوانِ ناطق" کے تکلف اور خاموشی سے تنگ آ جاتی تو اُسے فلیٹ کے نیچے پھینک دینے کی تجویز رد کر کے خود ہی نڈھال ہو کر صوفہ پر نیم دراز ہو جاتی. آنکھیں بند کر لیتی. نیند آنے کا بہانہ کر کے وہ ذرا اونگھتی تو یہ ادیب اُٹھ کر چلا جاتا.

وہ اُٹھ کر چلا گیا. نگار کس قدر خوش ہوئی کہ وہ چلا گیا. اسے تعجب ہوتا تھا کہ ادیب اور پھر وہ بھی ترقی پسند، اس قدر جلدی

اُٹھکر کیسے چلا جاتا ہے، ادیب اور پھر ترقی پسند ادیب ہو کر اس قدر بچی کیوں نہیں ہے جیسے اور سب ہیں۔ اس کی احمقانہ حد تک پہونچی ہوئی کم گوئی نگار کے لئے واقعی ایک عجوبہ چیز تھی۔ آپ ترقی پسند ادیب کی بالخصوص کوئی پہچان مقرر نہیں کر سکتے اس لئے وہ کسی وقت بھی "خدشۂ عمومی" (Public menace) بن سکتے ہیں!۔

نمازِ تہجد کا وقت ——!

ایک باریک سی قمیص میں اس کا مترا کے کنٹروں کی طرح سخت و مدوّر سینہ کسی طرح پر سکون حالت میں آ چکا تھا۔

وہ ابھی اس کے پہلو سے اُٹھ کر گیا تھا۔ اُسے کچھ ایسا ہی ضروری کام تھا ورنہ وہ بڑی خوشی سے یہاں شب بھر بھی رہ سکتا تھا۔ وہ نڈر، بیباک اور معمولی طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے نزدیک ہر چیز فطری پہلے تھی اور شاعرانہ بعد میں۔ اس کے لئے دو اور دو ہمیشہ چار ہی ہوتے تھے۔

نگار کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھیں جیسے جاڑوں کی رات کو تارے۔ رخسار گلِ انار کی مانند دہک رہے تھے۔

دروازہ بند ہونے کی آواز سنکر اس کا دل ڈوب گیا۔ دروازے روزانہ اور ہر وقت کھلتے اور بند ہوتے رہتے تھے مگر جب یہ مرد باہر

گیا تو اس کے جانے سے نگار اپنے پلنگ پر ایک طرف پژمردہ پھول کی مانند پڑی رہ گئی۔

مردوں کے لائے ہوئے صبح کے تحفے ایک طرف رکھے تھے۔ خوبصورت، نازک، قیمتی، علم ریز، دعطر بیز تحفے، بے توجہی کا شکار بنے ایک طرف پڑے تھے۔ انہیں ان میں سے کسی چیز کی پروا نہ تھی ــــ!

یہ مرد تھا۔ وہ اسے نہ تو کوئی آسمانی مخلوق سمجھتا تھا نہ اُسے کوئی آستانۂ مرمریں سمجھتا تھا کہ اس پر قربانیاں چڑھائے۔ نہ وہ اُسے کوئی پارۂ ادب و شعر سمجھتا تھا ــــــــ وہ تو اسے ایک خوبصورت عورت سمجھتا تھا اور اس کے لبوں کو چوم لینا ذوقِ انسانی کا فطری رجحان سمجھتا تھا۔ وہ اُسے گرم گوشت کی بنی ہوئی ایک ہستی سمجھتا تھا اور پورے جوشِ مردانہ کے ساتھ وہ اُسے سب کچھ دے سکتا تھا جو ایک جوان صالح، خلافِ معمول ہوئے بغیر کسی خوبصورت عورت کو دے سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خلافِ معمول بات نہ تھی، کوئی عدم مطابقت نہ تھی اور جہاں تک عورت کا تعلق ہے اس کی زندگی میں عورت کبھی اس پر بھوت کی طرح سوار نہیں ہوئی تھی۔ وہ عورت کو اس کے ایسے مقام پر نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ تصور تو تصور لبوں تک کی رسائی نہ ہو ــــ!

نگار کی آنکھیں مسرت و طمانیت سے تابندہ تھیں۔ اس کی

پیشانی کی رگیں بربط کے تاروں کی طرح لپک رہی تھیں جیسے ابھی ابھی مضراب اٹھایا گیا ہو! اس کے رُخسار انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کا سینہ اس جانے والے مرد کے لئے پھر ایک بار زیروزبر ہوا ــــ اُسے ملال ہوا کہ ایک مرد کسی عورت کے پاس سے اس قدر جلد اُٹھ کر کیوں چلا جاتا ہے۔

نمازِ فجر کا وقت تھا ــ!

مؤذن کی آواز آرہی تھی! ــ

"اللہ اکبر! اللہ اکبر!"

نگار نے ایک کرب کے ساتھ کروٹ لی۔ خدا کی عظمت کے ثبوت، مرد، کا خیال کرتے ہوئے اس کے لبوں سے کراہنے کی آواز آرہی تھی! ــ

"مرد بہت بڑا ہے"۔

"مرد بہت بڑا ہے"

وہ ایک کسبی تھی!

(جب کسبی "خدا" کے سامنے جاتی ہے تو "خدا" کیا کرتا ہے؟ ـــــ سوال کا جواب. ترقی پسندانہ تخیلہ کے مطابق ایک تعبیر.)

گلنار نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے کمرے میں پایا۔ کمرہ کیوں. اسے ایک بہت وسیع ایوان سمجھئے. وہ کھڑی ششدر و حیران اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے چاروں طرف دیواریں، بلند اور شفاف دیواریں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ان کے وار پار دیکھ سکتی تھی اور حیران تھی کہ یہ دیواریں ہیں بھی یا نہیں. اس نے ایک دفعہ دیوار کو چھوا تو معلوم ہوا کہ وہ اسے چھو بھی نہیں سکتی. جونہی وہ آگے بڑھی دیوار پیچھے ہٹ گئی اور اس کی جگہ ایک اور دیوار آ کھڑی ہوئی۔ یا جونہی گلنار دیوار کی طرف بڑھی دیوار آگے آئی اور اسے ہڑپ کر گئی. پھر تھوڑی دیر بعد اپنے مہیب پیٹ میں سے ایک دھماکہ کے ساتھ اسے باہر اگل دیا.

یہ دیواریں ایسی تھیں کہ ان کے اس پار جانا ناممکن تھا جیل

کی دیواروں کی طرح وہ ناقابلِ عبور تھیں۔ یہ دیواریں بہت بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ اور اس گنبد تک پہونچی تھیں جو زنگار رنگ بادلوں نے ان دیواروں پر بنا رکھا تھا۔ بادل طرح طرح کے تھے۔ بھاری بھاری۔ ہلکے ہلکے۔ زرد۔ ہلکے سبز۔ نیلے۔ پیلے۔ گلابی۔ بہت گہرے آسمانی۔ ان بادلوں کے رنگ ذرا ذرا سی دیر میں بدل رہے تھے۔ کبھی کچھ ہو جاتے تھے کبھی کچھ۔ بادلوں کی رنگا رنگی کے ساتھ دیواروں کے رنگ بھی بدلتے رہتے تھے۔ گلزار ششدر کھڑی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اس مقام پر آدمی ہی آدمی تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے مگر چہروں سے سنجیدگی اور خشکی ٹپک رہی تھی۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ اُن کی لمبی عباؤں کو اگر پکڑنا چاہیں تو وہ قبضہ میں نہیں آسکتے تھے۔ یہ ہنستے بھی نہ تھے۔ نہ بولتے تھے نہ محسوس کرتے تھے۔ بس ان دیواروں کی طرح یہ بھی تھے ـــــ سائے۔

گلزار کو اس وقت فوجداری عدالت کا کمرہ یاد آگیا۔ جہاں پیر کے دن خاص طور پر بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ اس روز پولیس بدمعاش عورتوں، اوباش شہریوں اور بدکردار شرابیوں کے چالان پیش کیا کرتی تھی۔ عدالتِ مجاز نئے وقت سے ٹھیک دس بجے آجایا کرتی تھی اور چالان پر چالان پیش ہونے شروع ہو جاتے تھے۔

گلزار کو اس وقت وہ عدالت یاد آرہی تھی جہاں وہ بیٹھی

سال تک متواتر نہیں تو بار بار پیش ہوا کرتی تھی۔ حاکم بھی تنگ آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کا حاکم۔ اور اس سے پہلے کا حاکم سب اس سے تنگ آ جاتے تھے مگر وہ باز نہ آتی تھی۔ وہ کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔ پولیس انسپکٹر کا بیان سن کر عدالت گلزار سے پوچھتی کہ کیا یہ الزام درست ہے کہ تم قلعہ کے نیچے علانیہ بدکاری کی دعوت دیتی پھرتی ہو۔ تم تانگوں میں گذرنے والے جمعہ کی تنخواہ سے خریدی ہوئی بیئر سے بدمست گوروں کو ورغلاتی ہو۔ فحش کلمات سے انہیں پکارتی ہو ــــــ ساب جار آنہ۔ ساب فور آناز۔ ویری گڈ۔ ویری چیپ ؛ کہکر تم گوروں، ہندوستانی فوجیوں اور دیگر راہگیروں کو آتشک بانٹا کرتی ہو؟

گلزار جواب دیتی ہے سرکار ــــ! ؛ مطلب ہوتا تھا کہ وہ اقبالی ہے۔

"چار مہینہ قید یا چالیس روپے جرمانہ!" ہمیشہ اُسے یہی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن حلال کی موٹی کمائی والے حاکموں کو بھلا کیا پتہ تھا کہ آجکل حرام کی کمائی کس قدر کٹھن طریقے سے پیدا ہوتی ہے اور چالیس روپے گلزار کے لئے کیا معنی رکھتے ہیں۔ وہ کبھی جرمانہ ادا کرنے کے قابل ہی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے چالان اس قدر تیزی کے ساتھ ہوتے تھے کہ چالیس روپے وہ کبھی ادا نہ کر سکی۔ تھوڑی سی کمائی ہوئی کہ پھر اُسے کچہری میں دیکھ لیجئے۔

آج وہ ایک عجیب سی جگہ بہت اونچائی پر جمی ہوئی ایک عدالت

کے سامنے پیش تھی۔ عدالتوں میں سوال جواب کرنے یا سزا کا حکم سننے سے اب وہ گھبراتی نہ تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ زیادہ سے زیادہ کیا سزا ہے۔ آج وہ اپنی آخری سزا کا حکم سننے کے لئے ایوان میں کھڑی تھی۔

عدالتوں میں اس کا چالان کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ کوئی سو دفعہ؟ نہیں صاحب! اس سے کہیں زیادہ۔ کچہری میں سب اُسے جان گئے تھے۔ پولیس کانسٹبل اُسے پکڑتے پکڑتے تھک گئے تھے جب دیکھو قلعہ کے نیچے کسی گورے کی جیب پکڑے کھڑی ہے۔ اسے فحش گالیاں غلط انگریزی میں بُرے دیسی تلفظ کے ساتھ دے رہی ہے۔ سینکڑوں دفعہ اُسے نیم بے ہوش حالت میں گھاس پر سے اُٹھایا گیا تھا۔ رات کی بدمستی کا انجام اس کے کپڑوں سے ہویدا۔ مقامی کالجوں کے بدمعاش لڑکے اُسے چار چار آنے میں لے جاتے تھے۔ وہ مانگتی رہ جاتی تھی۔ بابا تانگہ بھی دس آنے گھنٹے سے کم میں نہیں آتا۔ دو آنے تو اور دیتے جاؤ۔ مگر یہ جوانانِ ہند اسے چھیڑتے۔ ستاتے اور اپنے سینے میں مزدوروں کی مدد کا جذبۂ فراواں لئے ہوئے چلے جاتے اور وہ چلاتی رہ جاتی کہ بابا کیا ظلم ہے۔

جونہی وہ کچہری میں جاتی لوگ کہتے "میم صاحب آگئیں۔ گوروں کی جورو آگئی"! وہ گوروں کی جورو مشہور ہو گئی تھی۔ وہ سب ہی کی جورو تھی۔ گورے اگر اس کی فحش کلامی پر یا نشہ کی غلامی سے مجبور ہو کر اسے

مارتے پیٹتے تھے تو کیا تھا، پیسے تو وہ زیادہ دیتے تھے: کالے گورے" (دیسی سپاہی) سے وہ بات نہیں کرتی تھی. ہندوستانیوں سے وہ چوری چوری ملتی تھی تاکہ گورے اس سے ملنا نہ چھوڑیں.

پیشکار خاصا بھلا آدمی تھا. گرہستی. بال بچہ دار. یہ حاکم بھی یہاں عرصے سے تھا. دونوں مل کر افسوس کرتے تھے اور قانون کی لکڑی آنکھ بند کر کے گھماتے جاتے تھے: چار مہینے یا چالیس روپے جرمانہ: وہ ہزاروں دفعہ یہ فقرہ سن چکی تھی اور دل میں قانون بنانے والوں کی بہت ممنون تھی کہ انہوں نے سزائے قید کی بجائے سزائے جرمانہ بھی بدل میں رکھی ہے. کاش وہ کبھی قانون سازوں کی فیاضی اور نیک طبعی کا خیر مقدم کر سکتی!

غرض یہ کہ وہ عدالتوں سے، پولیس کی داروگیر سے، اور قانونی شکنجوں اور انصاف کی زور آزمائیوں سے خوب آگاہ تھی. اسے اب کسی عدالت کا خوف نہ تھا، وہ کسی عدالت سے نہیں ڈرتی تھی. خواہ کتنی ہی اونچی ہو. عدالتیں کیا کرتی ہیں، عدالتیں سزائیں دیا کرتی ہیں. سزا سے وہ کیا ڈرے. یہ عدالت بھی سزا دیدے، کتنی دیدیگی. جتنی اونچی عدالت ہے اتنی ہی زیادہ سزا دیدے گی. بس یہی نہ. اس سے کیا ڈرنا. عدالتیں سب اندھی. قانون سب یک طرفہ اور سزائیں سب یکساں و بے نتیجہ. پھر ان کا طویل مختصر ہونا گلزار کیلئے بے معنی بات تھی.

وہ خود بھی تنگ تھی اس زندگی سے۔ اچھا ہوا یہ ختم ہو گئی۔ زندگی کا انجام بہت سہولت سے ہو گیا۔ معمولی سا نمونیہ ...... سب یاد تھی اسے وہ بات وہ رات جب اسے کسی نے ننگا کر کے گیلی گھاس پر ڈال دیا تھا۔ رات بھر وہ نشہ میں چور اوس میں گلتی رہی۔ صبح اٹھی تو وہ کھانس رہی تھی۔ ہلکا بخار چڑھ رہا تھا۔ شام تک تیز ہو گیا۔ خیراتی ہسپتال میں داخل ہوئی۔ نرس بہت اچھی تھی، اس نے بہت کوشش کی۔ اس کے پاس جتنی دوائیں اور آئے تھے وہ سب اس کی میز کے گرد لگا دیے گئے۔ ڈاکٹر کو بھی ترس آیا تھا لیکن ان تمام آرائشوں کے باوجود وہ کھانستے کھانستے ختم ہو گئی تھی۔ اور بس۔ گلزار ختم ہو گئی۔ سب کو الوداع۔ ساری دنیا کو خدا حافظ۔ گلزار کا انجام اس قدر سیدھا سادا ہوا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا۔ معمولی سی واردات۔ ذرا سی تکلیف؟ اب مرتے ہی سب پریشانیوں کا خاتمہ۔ جیسے گیلی انگلی میں سے پھنسی ہوئی انگوٹھی معمولی تکلیف سے بغیر کوئی خراش چھوڑے باہر نکل آتی ہے۔ بعض زندگیاں گذارنے میں کٹھن ہوتی ہیں اور ختم کرنے میں آسان۔

واقعہ یہ ہے کہ گلزار موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ مرنے کا اسے ذرا غم نہ تھا۔ اسے جان دینے کا خوف ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ تو بہت عرصہ پہلے مر چکی تھی۔۔۔ آج سے بیس سال قبل ....

گلزار اس ایوان کے فرش پر رخساروں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں

کے بیچ میں رکھے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس کے اردگرد جس قدر سائے تھے
وہ آگے پیچھے حرکت کرتے ہوئے نہ جانے کس طرف چلے جا رہے
تھے اور اُن کی جگہ دوسرے سائے قائم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ نئے
سائے نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے اور پرانے سائے اب کس مقام
کی طرف رجوع کر رہے تھے وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ نئے سائے بھی خشک چہرہ
تھے سنجیدہ اور بہت متین۔

دیواروں کا رنگ یکایک بدلا۔ ہلکا خشک رنگ۔ سبز ہو گیا اور
ایوان کا گنبد بھی آسمانی ہو گیا۔

جی ہاں بیس سال ہوئے۔ بیس سال ہوئے کہ گلزار فی الحقیقت
مری تھی جسمانی طور پر نہیں روحانی معنوں میں اس کا دم آج سے بیس
سال قبل ہی نکل چکا تھا۔

اسے سب یاد تھا۔ اب اسے کوئی بات بھی یاد کر کے دُکھ نہ
ہو سکتا تھا۔ اس وقت اُسے ہر چیز یاد آ رہی تھی۔ آنے دو یاد۔ یہ وہ مقام
تھا جہاں کوئی یاد انسان کے دل کو دکھ نہیں دے سکتی۔ وہ ان
سایوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ دیواریں
ایسی سبز تھیں جیسے بیس سال قبل اس کی جوانی ہری بھری تھی
آسمان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ کیا اس کی آنکھیں دھوکا دے رہی
تھیں۔ آسمان اور ایوان یکایک تاریک ہو گئے۔ بالکل اس گلی کی
طرح جس میں اب سے بیس سال قبل اس نے پہلی بار اپنے باپ کے

گھر سے ایک مرد کیلئے قدم نکالا تھا۔ اُسے وہ گلی اسکی بھیانک تاریکی یاد آگئی، جسے پریم کی جوت نے ایک رات جگمگا دیا تھا۔

اُف! اس سے گلزار کو کس قدر گرم اور شدید محبت تھی......

وہ راتوں کی رات!.....

ایوان و در پھر چمکے مگر پھر اندھیارا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا کی تاریکی اس تاریکی کے مقابلے میں ملگجی چھینٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ سخت اندھیرا۔

گلزار کو ایسا معلوم ہوا کہ ایوان و در سب سیاہ مرمر کے ہو گئے ہیں۔ مگر اُسے کچھ پروا نہ تھی۔ باہر کی تاریکی اُسے کیا ڈرا سکتی تھی۔ اسکے اندراہرمن نے ایک بھٹی بنا رکھی تھی۔ اس کی کلونس سے کوئی تاریکی زیادہ تاریک اور کوئی غلاظت زیادہ گھناؤنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے تاریکی کا خوف نہ تھا۔ مطلق نہیں۔

وہ رات اور دن معصیت کی تاریک سڑک پر ہی
تو چلتی رہی تھی۔ دن رات۔ برابر مسلسل بیس سال
تک۔ قدم قدم پر گرتی سنبھلتی۔ تلقینِ ابلیس کو عصائے
رہگذر بناتی ہوئی وہ بیس سال تک تاریکی کے سایہ
دار شاہراہ پر چلتی رہی تھی۔

وہ بھی گلزار کو چاہتا تھا۔ دل سے عاشق تھا......۔ گلزار نے اب چاروں طرف شعلے لپکتے ہوئے دیکھے۔ ایوان و در سُرخ و

طپیدہ ہو گئے۔

ہاں۔ وہ بھی اُسے دل سے چاہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا تھے۔ نیک اور سچی محبت اپنا کام کرتی رہی۔ مگر پھر مرد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور ایک جگہ کسی نظارے نے اس کی نگاہ اپنے میں جذب کر لی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مرد اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ گلزار کا بس اتنا ہی قصور تھا۔ اس نے صدق دل سے محبت کی تھی۔ اور عورت جس قدر دے سکتی ہے وہ سب کچھ اُس نے دے دیا تھا۔ مرد جو کچھ عورت سے لے سکتا ہے اس سے لیکر کسی اور جگہ چلا گیا تھا: عورتیں کہاتے "مرد کمائے بغیر نہیں رہتا۔ مرد ایک بڑا سرمایہ دار تاجر ہے۔ عورت کی ایک چھوٹی سی پونجی ہوتی ہے اور وہ اُسے لُٹا کر کوئی بنج نہیں کر سکتی۔ گلزار کی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا تھا کہ اسے کس قصور کی پاداش ملی ہے۔

کیا محبت کرنا گناہ ہے یا عورت ہونا گناہ ہے۔ یا ایک مخلص اور حسّاس دل کا مالک ہونا گناہ ہے۔ یا یہ ہستی گناہ ہے۔ وہ اس سوال کا جواب پانے کیلئے سب سے بڑے حاکم کے سامنے آئی تھی۔

گلزار کو سب یاد تھا۔ وہ چلا گیا۔ اور اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ جیسے پر کا کاغذ سے ہٹنے کے بعد ایک ہلکا سا نشان چھوڑ جاتی ہے۔

بچہ زیادہ عرصہ نہیں جیا۔ ابھی وہ فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ

بچہ مرگیا۔ جس گھر میں اسکے غیرت مند ماں باپ نے زچگی کا بندوبست کیا تھا وہاں رازدارانہ سرگوشیوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور اسے مجبوراً وہ شہر چھوڑ کر دوسری جگہ سر چھپانا پڑا۔

اسے بڑی مشکل سے ایک گھر میں آیا کی جگہ ملی۔ اس نے اپنے آپکو بہت سمجھایا کہ اگر آئندہ کوئی لغزش کی تو دنیا تجھے کوڑے کی طرح سڑک پر پھینک دے گی۔ اور روندتی ہوئی گذر جائے گی۔ اور اگر گذرنیوالوں کے جسم و لباس تیری آلودگی سے غلیظ بھی ہو جائیں گے تو تجھ پر رحم نہ آئے گا نہیں۔ وہ یا تو تجھے گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے گذر جائیں گے یا اس انتظام کو لتاڑیں گے جو سڑک پر غلاظت پڑی رہنے دیتا ہے لیکن کوئی بھی اسے صاف نہ کریگا اور تو یوں ہی سڑک پر خراب و خستہ ہوتی رہے گی۔ لوگ غلاظت سے سڑک کو پاک تو رکھنا چاہتے ہیں مگر یا تو بچ کر نکل جاتے ہیں یا ٹھوکر مار کر اسے اور بکھیر دیتے ہیں مگر ہاتھوں کو کام میں نہیں لاتے کہ یہ غلاظت ان کے دستِ عمل سے صاف ہو جائے۔ لوگ نیچ ہونا پسند کرتے ہیں نیچ کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ معلوم نہیں لوگ اونچ اور نیچ کی لغت کے معنی اپنی اپنی ذہنی ڈکشنریوں میں کب درست کریں گے۔

وہ کام کرنے لگی۔
وہ سوچتی تھی کہ عورت محبت کرنے کے بعد کیوں مرجاتی ہے۔

مرد اُسے چھوڑ کر اور خدا اُس کے بچّے کو فوراً واپس لے لینے کے بعد کیوں چپ ہو جاتا ہے۔

جہاں وہ کام کر رہی تھی وہاں ایک بڑی عمر کی عورت تھی اور ایک بچّہ۔ جس کی ماں کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس بچّے کا ایک باپ تھا اور یہ اُس کی ماں تھی۔ گلزار اپنا کام ٹھیک طرح کر رہی تھی۔ مرد بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ ماں بھی اپنا فرض ٹھیک طرح انجام دے رہی تھی۔

مرد نے یکایک یہ شکایت محسوس کی کہ بچہ رات کو بہت روتا ہے۔ آیا اس بچّے کو لیکر اس کے کمرے کے باہر برآمدے میں سوئے۔ وہ سونے لگی۔ چند روز بعد ماں کو شکایت ہوئی کہ آیا اس کے بیٹے کو چھین رہی ہے۔ اس پر ماں بیٹوں میں تکرار بھی ہوئی۔ اپنے فائدے کے لئے مرد بہت لڑ سکتا ہے۔ مگر ماں سے بہن سے اور رقیب سے۔ لیکن صرف محبوبہ کی خاطر نہ وہ ماں سے لڑ سکتا ہے نہ بہن سے نہ بیوی سے نہ رقیب سے۔ اس کو اگر اپنے لئے لڑنا ہے تو لڑے گا۔ ورنہ معمولی سی جھڑپ کے بعد خاموش ہو جائیگا۔ ماں کے حکم اور بیٹے کی نیم رضا والی خاموشی نے گلزار کو پھر سڑک پر ڈال دیا۔

اُس نے ایک اور جگہ نوکری کر لی۔ وہاں بھی ایک بیٹا تھا۔ اس بیٹے نے ماں کے خوف سے گلزار کی خاطر زہر کھا لیا۔ ماں نے مارے سسکیوں اور آنسوؤں کے گلزار کو پھر سڑک پر دھکیل دیا۔ اس دفعہ گلزار

کوماں کے رونے پر بہت زور کی ہنسی آئی۔

گلزار اپنے خیالات کی رَو میں بہے جا رہی تھی کہ یکایک وہ ٹھہر گئی۔ اس نے غور کیا کہ اس وقت اُسے اپنی ساری زندگی کیوں یاد آ رہی ہے۔ اُس نے تو اپنے ماضی کو دوبارہ دیکھنے کی کبھی پروا کی ہی نہ تھی۔ یہ آج اسے کیا ہو رہا تھا۔ کیا اس جگہ کا اثر تھا؟ کیا یہاں پہونچکر انسان اپنے ماضی کو یاد کر کے اپنی روح کی نجات کیلئے کوئی عذر تلاش کرتا ہے۔ مگر اس کے لئے کوئی چیز باعثِ نجات نہیں ہو سکتی تھی۔ بیس سال تک وہ اپنے جسم کا زندہ گوشت مردار خوار انسانی گدھوں کو کھلاکر ان کی گرسنگیٔ عشرت کی تسکین کرتی رہی تھی۔ جب اس عملِ شہادت نے اُسے نجات کی خوشخبری نہ سُنائی تو بھلا موت اس کی رُوح کو کیا نجات دلا سکتی تھی۔

اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ رات کی گلابی سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ سائے جو اَب سفید ہو گئے تھے یا تو پیچھے ہٹ کر غائب ہوتے جا رہے تھے یا ان کی تعداد اَب گھٹ رہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ وہ میلوں تک دیکھ سکتی ہے۔ دُور ایک مقام پر، ایک عورت دکھائی دی۔ اس نے غور سے دیکھا، یہ وہی عورت تھی جو اس کے شہر میں کبھی رہتی تھی۔ اور اس نے اس کے مرد کو چھین لیا تھا۔ کیا وہ بھی اسی مقام پر آ چکی ہے۔ کیا وہ گلزار کو دیکھ کر اپنے قصور کی معافی مانگے گی؟ مانگے یا نہ مانگے۔ ایسی ایسی بہت سی عورتیں اور

سینکڑوں "گلزاریں" یہاں موجود ہوں گی. یہاں کون کس کو پہچانتا ہے۔ کون کس کو پوچھتا ہے. گلزار نے اس عورت کی طرف دیکھ کر تھوک دیا........

گلزار نے دیکھا کہ ماضی کی یاد برابر آئے جا رہی ہے. جب مستقبل تاریک ہو تو ماضی بڑا منور ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ ماضی کی یاد کو محو کرنے کیلئے وہ کیوں پریشان ہے۔ اچھا، یہ خیالات بادلوں کی طرح گھر گھر کر آ رہے ہیں. آنے دو اسے پرواہ نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے سب ہونے والے واقعات ایک کتاب میں لکھے ہوئے ہیں اور وہ ہو کر رہتے ہیں جب یہ بات ہے تو انہیں جلوس در جلوس آنے دو. میں انہیں ہونے سے نہ روک سکی تو دماغ میں آنے سے روک سکتی ہوں۔

یہ سب واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گذر رہے تھے. اس نے غور سے دیکھا کہ یہ مقام تو اب بالکل سنسان ہو چکا ہے. سب جا چکے تھے. ایک خلائے محض. ایک ردائے نیلگوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا. اس کے اور اس کی یاد کے سوا اب اس میدان میں کوئی نہ رہا تھا. اس کی زندگی کی یاد ایک جلوس کی صورت میں اسکے دریچۂ تصور کے سامنے سے گذر رہی تھی. اسوقت اس ایوانِ بسیط میں کوئی نہ تھا۔

گلزار کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ سینما سا دیکھ رہی ہے.....

ایک خالی اصطبل تھا جہاں وہ اپنے "دوستوں" کو لے جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہاں ایک اور عورت آئی اور دونوں میں کسی "مہمان" کے "رکھنے" پر لڑائی ہوگئی۔ دونوں کی چیخ پکار سُن کر لوگ جمع ہوگئے۔ دونوں عورتیں پکڑی گئیں۔ "مہمان" مرد پولیس والوں کا "لحاظ" کر کے پہلے ہی کھسک گئے تھے۔

پھر دونوں میں صلح ہوگئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ ٹھنڈی سڑک کو دو حصوں میں بانٹ لیا جائے۔ گلزار قد کی چھوٹی اور رنگ کی اچھی تھی اسے سڑک کا نچلا حصہ دیا گیا۔ کالی لمبی عورت چونکہ دبنگ تھی اسلئے اس نے سڑک کا باقی حصہ ہتیا لیا۔ کبھی کبھی وہ "بین الاقوامی قانون" کی خلاف ورزی کر کے گلزار کی سرحد میں بھی گھس آتی تھی۔ مگر پھر بھی دونوں میں اس بات پر کافی مفاہمت تھی کہ اس سڑک کو ملکر خوب خوب گندہ کریں گے۔

سڑک!

جی ہاں! سڑک کے سوا وہ اور کہیں جا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ چکلہ کی فضا اس کو راس نہ تھی۔ وہاں ایک دفعہ اسکی ناک کٹتے کٹتے رہ گئی تھی۔ وہ سڑک کی قائل تھی۔ رات کو سڑک صبح کو چاندنی چوک میں چیزیں چرانا اور ڈگا نداروں کی لتاڑیں کھانا اُسے بہت پسند تھا۔ اُسے سڑک پسند تھی اور وہاں سوائے نئے تعینات شدہ پولیس

والوں کے اور کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ سڑک پر ٹہلتی ہوئی کسبی معلوم بھی نہ ہوتی تھی۔" فوراً ناز۔ ڈارلنگ! کم آن جیمی!" میں اس نے معاش کا ایک نہایت سہل اور نفع ریز طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ یہاں مقابلہ بھی کم تھا اور وہ بالکل مطمئن تھی۔ قلعہ کے گورے کے علاوہ کالج کے لڑکے اور بائسکوپ سے آنے والے ہفتہ کی رات منانے کے متلاشی بابالوگ۔ ایک وسیع سرسبز میدان قلعہ کی نشیب دار زمین اور محاذ نظر سے ہٹی ہوئی درختوں کی "ستار العیوب" تاریکی اسکے لئے بہترین "اسٹوڈیو" تھے۔

مرد۔ ـــــ مرد بیس سال سے اس کے سامنے سے گذر رہے تھے۔

سب سے پہلا مرد عاشق تھا۔ دوسری عورت نے اُسے اس طرح کھینچ لیا جیسے شریر لڑکے بڑھی ہوئی پتنگ کو لانگر ڈال کر گھسیٹ لیتے ہیں۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ پتنگ کس کی ہے۔ مگر ہے تو جاذب نظر! ـــــ اس کے بعد ایک دو واقعات اور ہوئے۔ ایک آدمی اُسے ایسا ملا جو داشتہ رکھنے کا شوقین تھا۔ چند روز بعد اس سے بھی لڑائی ہو گئی اور اس نے گلزار کو سڑک پر دھکیل دیا۔ یہ اسکی سڑک والی زندگی کی ابتدا تھی۔ سڑک کی یا گندہ کام کی اُسے پروا نہ تھی۔ اُسے کسی چیز کی پروا نہ تھی ہاں پٹنے سے ڈرتی تھی۔ دل اس کا بیشک مر چکا تھا مگر جسم بشریت کے باعث اب بھی تکلیف محسوس

کرتا تھا۔ اس لئے وہ پٹنے سے ڈرتی تھی۔ ایک روز اس کے ایک پرانے عاشق نے بہت مارا۔ وہ نشہ میں تھا، یہ اُسے چاہتی تھی۔ دونوں مدہوش تھے اور انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہی نہیں ہیں۔

اس کے بعد سینکڑوں مرد اس کے راستے میں آئے اور اپنے اپنے دستخط اس کی کتاب زندگی میں ثبت کر کے چلے گئے۔ اسے کسی کا نام اور چہرہ یاد نہیں تھا۔ نام وہ پوچھتی کیوں اور چہرہ اسے یاد کیوں رہتا۔

شراب ــــــ ہاں۔ شراب، بھوک کو روک سکتی ہے، پیاس کی تسکین کر سکتی ہے۔ شراب آپ کے جسم کی تکان کو دُور کر سکتی ہے۔ لیکن ایک چیز وہ نہیں کر سکتی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پینے والا شراب میں گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ گلزار بھی پینے لگی اور بہت عرصہ تک وہ پیتی رہی اور اپنے آپ کو سنبھالتی رہی۔ مگر ایک حد کے بعد وہ ڈوبنے لگی۔ تیراک اچھی تھی۔ ڈوب کر مری نہیں۔ نہیں ہاں تیرتی رہی مگر شراب نے اُسے ساحلِ عافیت سے کبھی ہم کنار بھی نہیں ہونے دیا۔

غرض اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ دن ہفتے بنے۔ ہفتے مہینے۔ پھر سال بنے۔ اس ہی طرح ایک زندگی کی عمارت منزل بہ منزل اٹھتی چلی گئی۔

ایوان کی دیواریں جو اُوپر تک چلی گئی تھیں۔ اور اس کا گنبد سب فولاد کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

گلزار لرز گئی۔ اب وہ یہاں سے بھاگ کر نہیں جا سکتی تھی۔ پہلے زمین سخت تھی اور آسمان دُور تھا۔ اب اس کے برعکس تھا۔ کیا سزا دینے والے اب اُسے لینے آئیں گے۔

سائے ——— ماضی کی یاد ——— سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اس کا ایک ہاتھ ایک طرف کو جھک گیا۔ کبھی کبھی وہ اس ہاتھ کو بے خیالی میں ہلانے لگتی تھی۔ جیسے وہ کسی ملبے کے ڈھیر کو بکھیر کر اس میں سے کوئی چیز نکال رہی ہو۔ جیسے اسے کوئی چیز درکار ہو۔

وہاں دیکھنے اور تلاش کرنے کی چیز ہی کیا تھی ؟ — تھا کیا وہاں — ایک مستقل مزبلہ — غلاظت ! — چاروں طرف یہی ڈھیر تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں یہی عمل کئے تھے۔ اور یہی چیز اسکے اردگرد جمع تھی۔ وہ اس غلاظت کے ڈھیر میں سے کوئی ایسی چمکتی ہوئی گرم و دلگداز نیکی نکالنا چاہتی تھی جسے وہ اپنے سینے سے چمٹا کر اس وقت منصفِ حقیقی کے سامنے جا سکتی اور کہتی کہ میرے پاس بس یہی ایک ہیرا ہے۔

یکایک اس کے سامنے ایک ہاتھ آیا۔ آہستہ آہستہ نہ جانے کہاں سے۔ اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کی نگاہیں بےبس

اشارے کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھیں۔ دور، فولاد کی دیواریں نرم ہو گئیں۔ سونے کے رنگ کی ہو گئیں اور اُسے ایسا دکھائی دیا کہ ایک ننھا سا بچہ ایک باغ میں کھیل رہا ہے اور وہاں گلزار بھی ہے اور اس بچے کے ساتھ کھیل رہی ہے۔

وہ سمجھی یہ سب واہمہ ہے۔ وہ ایسی نیک روح کہاں ہے کہ اس باغ میں اپنے بچے کے ساتھ کھیلتی دکھائی دے۔ کاش وہ اس وقت اس بچے کو جا کر چمٹا سکتی۔ اپنی محبت کے اس نمونے۔ اپنی بریت کے اس ثبوت کو اپنے سینے سے چمٹا سکتی۔

گلزار کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو امڈ آئے اور ان آنسوؤں میں سے اُس نے دیکھا کہ باغ کو جو دیوار روک رہی ہے وہ نرم ہو گئی ہے۔ اس پر بہت سی "گلزاروں" کے آنسو آہستہ آہستہ گر رہے ہیں۔ اور موتی بنتے جا رہے ہیں۔

گنبد نیلگوں دمک رہا تھا۔ ایوان منور تھا۔ ایسا نور کہ جس سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے چھپا لیں۔

لیکن وہ ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے زبردستی اس کے ہاتھ کو آنکھوں پر سے ہٹا دیا۔ ایسے زور کے ساتھ کہ گویا کسی نے اُسے آدبوچا ہو۔ وہ ہاتھ اُسے سہارا دئے اوپر اٹھائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسی آغوش میں ہے جو ماں کے

سینے کی طرح گرم ہے۔ روشنی برابر بڑھتی جارہی تھی۔ اسے نہ جانے کیوں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم جو گناہوں کا معبد رہ چکا تھا آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا جارہا ہے۔

اس ہاتھ نے اسے باغ کے صحن میں اس طرح رکھدیا جیسے کوئی پر آہستہ سے آکر گرتا ہے۔

گلزار نے دیکھا کہ وہ ایک بچّے کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ اس کا اپنا بچّہ! اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ باغ میں ہوسکتی ہے۔ اُسے اپنے تصوّر کی فریب کاریوں کا اب احساس ہوا۔ متذبذب وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ روشنی برابر بڑھ رہی تھی۔ ہاتفِ غیبی نے اس کے کان میں کہا۔ گلزار جب تو نے اپنی محبت کے لئے دکھ اُٹھایا تھا تو اس ہی وقت رحمت کی آغوش میں آگئی تھی۔ ہاں۔ آج سے بیس سال قبل ہم نے تجھے تیرے بچے کے ساتھ ہی یہاں بُلالیا تھا۔

گلزار حیران تھی کہ وہ یہاں کب آئی — ماں بنتے ہی! اس کو تعجب اور حیرت نے آگھیرا۔ گلزار اپنی ہستیٔ معصوم اور ہستیٔ مکروہ کے راز کو نہ پہچان سکی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا جسمِ مکروہ برف کی طرح پگھل رہا ہے۔

اس کی روح جو بیس سال قبل علیّین کی طرف پرواز کرچکی تھی اپنے جسم کو دیکھکر آگے بڑھی۔ ہاتھ نے اُسے وہیں روک دیا۔ اسکا مکروہ جسم گل کر ختم ہوچکا تھا۔

* * *

اب صرف ایک گلزار باقی رہ گئی تھی۔ بیس سال قبل جس نے مرد کے پہلے بوسہ کے ساتھ ایک الوہیت اختیار کر لی تھی۔ جسے عشق کی تاب نے ایک پرتوِ ربانی بنا دیا تھا۔

گلزار کو کچھ یاد نہ رہا کہ وہ یہاں کب آئی۔ وہ بچے کو لئے آہستہ آہستہ اس ہاتھ کی طرف بڑھی۔ نور نے سارے ایوان و در ملفوف کر لئے۔ بچہ مسکرایا اور ایک ایسی تنویر پیدا ہو گئی جیسے صبح صادق کی سہانی روشنی۔ جس نے باغ اور ایوان و در۔ فرش اور عرش سب کو مستور کر لیا۔ نورِ یزداں کے سوا کچھ باقی نہ رہا ـــــ!

ایک بندر تھا!

ڈاکٹر شنکر کی ایک بیوی تھی، اور دونوں کے تین بچے تھے، اور ان سب کی پرورش کرنے والی ایک پریکٹس تھی جو اس بستی میں انہوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد پیدا کی تھی۔ اس بستی کے لوگ جہاں یہ بات جانتے تھے کہ ڈاکٹر شنکر ایک بہت اچھے طبیب ہیں وہاں یہ بھی جانتے تھے کہ ریلوے ہوٹل میں رہنے والی پارسن سے ڈاکٹر صاحب خاص طور پر ملتفت ہیں۔

یہ بات ہر شخص جانتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر شنکر اپنی نجی زندگی کو خواہ مخواہ ظاہر کرتے نہیں پھرتے تھے اور نہ لوگوں کی رائے کی انہیں کوئی پروا تھی۔ لوگ بھی اس قماش کے ہوتے ہیں کہ جب تک گناہ یا عیب کو احتیاط سے روپوش کیا جا سکتا ہے اس وقت تک وہ کسی گناہ کو گناہ اور عیب کو عیب سمجھ کر جانتے اور محسوس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اس پارسن کے بارے میں مایا کو بھی سب کچھ پتہ تھا، مگر وہ دم بخود رہتی تھی۔ بعض عورتیں اپنے شوہروں کو ذرا آزاد چھوڑ کر پھر

جھپٹتی ہیں جیسے بلّی چوہے کو اپنے قبضہ سے آزاد کر کے اچانک جھپٹّا مارتی ہے اور مار کر اپنی چالاکی اور اس کی بے بسی پر ناز کرتی ہے۔

پارسن کا نام؟ — جانے دیجئے۔ اسے کیکاؤس و نوشیرواں کے خاندان سے سمجھکر کوئی بھی بھلا سا ایرانی نام دے لیجئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں اسے پارسن ہی کہا جاتا تھا۔

"مس پارسن صاحب" کو یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے لیکن کسی کو ٹھیک پتہ نہ تھا کہ وہ کس غرض سے اس بستی میں آئی ہوئی ہیں، اور ریلوے ہوٹل میں کیوں مقیم ہیں۔ ریلوے ہوٹل میں خرچ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے آدھے داموں پر وہ بستی میں کوئی مکان لے کر آرام سے رہ سکتی تھیں۔

ڈاکٹر شنکر کا مطب قریب ہی تھا۔ آتے جاتے اُن کی نظر ریلوے ہوٹل کی کھڑکی کی طرف اُٹھ جایا کرتی تھی جہاں انہیں پارسن لڑکی بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ ڈاکٹر شنکر کو اکثر ان ہوٹلوں میں آنا پڑتا تھا جہاں دُور دراز شہروں کے لوگ آکر نفیس نفیس کمروں میں رہتے اور خراب خراب کھانے، مہنگی مہنگی قیمتوں پر کھا کر ریلوں میں بیٹھ کر آگے چلے جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر شنکر کو یہ یقین تھا کہ کسی نہ کسی روز ریلوے ہوٹل سے کوئی مریض اُسے ضرور بُلائے گا اور جب وہ ہوٹل جائیگا تو اُسے بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ پارسن کون ہے۔ اس کے

پاس اتنا قیمتی سازوسامان کیوں ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ اس نے ایک بندر کیوں پال رکھا ہے۔ مس صاحب ہر وقت یہ بندر بغل میں دبائے کھڑکی میں بیٹھی بازار کی سیر کیا کرتی تھیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس بندر کو انہوں نے بچپن سے پالا تھا۔ اور ایسا سدھالیا تھا کہ بلّی کی طرح دبک کر گود میں آ بیٹھتا تھا۔

اس بستی میں بہت کم لوگوں کو بندر اس قدر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ویسے یہ بندر بھلا مانس تھا۔ قد کا چھوٹا۔ رنگ کا بھورا۔ آنکھوں میں شریر بچوں کی سی چمک۔ بات بات سے ذہانت آشکارا۔ اس کو قدرت نے مذاق سلیم عطا کیا تھا یا صحبتِ لطیف کے باعث اس میں مذاق سمجھنے اور برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ بہت کم وہ چھیڑنے پر جھلاتا تھا، مگر جب اُسے غصہ آجاتا تھا تو وہ بالکل بندر ہو جاتا تھا۔ بندر آخر کار بندر ہے۔

اس سے وہ بہت جلتا تھا کہ اس کی مالکہ سے کوئی ملنے آئے اور وہ اس سے ہاتھ ملائے۔ مصافحہ کرنے پر بندر پر ایک رقیبانہ جنون طاری ہو جاتا تھا۔ یہ جھنجلاہٹ جلد دُور ہو جاتی تھی کیونکہ پارسن لڑکی اسے جلد گود میں اُٹھا لیتی تھی، اور وہ اس کے سوسن جیسے چہرے کو اپنے دبیز ہاتھوں میں اس طرح پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا جیسے کسی موٹی ڈکشنری کے ورقوں میں گلاب کی پتیاں دبا کر رکھدی جائیں۔

"مس صاحب"، کو ریلوے ہوٹل میں آئے ہوئے ابھی تھوڑا

ہی عرصہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر شنکر کو "وزٹ" کیلئے بلایا گیا!

ڈاکٹر شنکر کو مس صاحب کے کمرے تک پہونچا دیا گیا۔ وہ اپنا بیگ لئے ہوئے داخل ہوئے۔ بستر پر ایک حسین مریضہ گرم کپڑوں میں لپٹی لپٹائی اس طرح پڑی تھی جیسے روئی کی پٹاری میں انگور، چہرہ نقاہت سے زرد، مگر رسیلی جوانی اس کے پیچھے جھلکتی ہوئی۔ تکیہ پر سیاہ چمکدار بالوں کا انتشارِ معطر اور ان کے بیچ میں ایک ننھا سا خوبصورت چہرہ اس طرح دمک رہا تھا جیسے سونے کو تاؤ دے کر رکھا گیا ہو۔ بخار نے اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سرخی مائل سنہری بنا دیا تھا۔

جونہی ڈاکٹر شنکر نے کمرے میں قدم رکھا، ہدایت کے مطابق نوکر بندر کو اٹھا کر باہر لے گیا جو پاس ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس کھٹ پٹ سے پارسن کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے لاپروائی سے دیکھا کہ کوئی آیا ہے۔ ایک آدھ لمحہ غور سے دیکھا اور آنکھیں پھر بند کر لیں لیکن یکایک وہ آنکھیں جو ابھی بند ہوئی تھیں پھر کھل گئیں۔ اور زیادہ غور سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگیں۔ لاپروائی توجہ سے بدل گئی اور بہت مشکل سے انہوں نے اپنے چہرے پر تبسم پیدا کیا۔

ڈاکٹر شنکر کو عادت ہو گئی تھی کہ گھر میں خواہ کیسی ہی سخت لڑائی ہوئی ہو اور بعض نادہند مریضوں نے اچھا ہونے کے بعد ان کے کئی بل خواہ کتنی ہی بے ایمانی سے ہضم کر لئے ہوں مگر جب

کسی مریض کے پلنگ کے پاس پہونچیں تو ضرور مُسکرا دیا کریں۔ چنانچہ وہ مُسکرائے۔ معائنہ شروع کیا۔ نتیجہ بہت جلد معلوم ہوگیا۔ مس صاحب کو انفلوئنزا ہوگیا تھا۔ بخار تھا اور بہت تیز۔ سارے جسم، جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے پروا نہیں ہے کہ مر جاؤں یا جیتی رہوں یہ درد ضرور کم ہو جانا چاہیئے۔

لیکن وہ مری نہیں اور ان کا درد بھی دُور ہو گیا۔ بعض ڈاکٹروں کا طریقہ علاج ایسا اچھا ہوتا ہے کہ آدمی مرتا بھی نہیں اور درد بھی جاتا رہتا ہے!

دوسرے روز جب ڈاکٹر شنکر مریضہ کو دیکھنے پہونچے تو بخار اُتر گیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی جیسے فیل ہو جانے کے یقین کے باوجود کسی ممتحن کی حسابی غلطی سے کوئی لڑکا اتفاقیہ پاس ہو جائے اور وہ خوشی سے اُچھل رہا ہو اور اس کی آنکھوں سے حیرت میں ڈوبی ہوئی چمک نکل رہی ہو۔ مس صاحب کے بال سنورے ہوئے تھے۔ چہرے کی رنگت کو مصنوعات جمال کے استعمال نے اور بھی دلاویز بنا دیا تھا، گویا ہاتھی دانت کی چوڑیوں میں طلائی مینا کاری کر دی گئی ہو۔

ڈاکٹر شنکر کے لئے یہ نظارہ ایک قلبی اضطرار کا باعث بن گیا۔

ڈاکٹر کے ماتھے کی رگیں پھولنے لگیں۔ کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور

جسم میں خون فوارہ کی طرح اچھلنے لگا۔ اس غیر معمولی کیفیت کو قابو میں رکھنا قطعی ضروری تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے ضبط سے کام لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب حواس بجا ہیں۔

مگر تیسرے روز جب وہ مریضہ کو دیکھنے آیا تو وہ مریضہ تو رہی ہی نہ تھی حسینہ ہی حسینہ رہ گئی تھی، اس لئے وہ بھی ایک قلب حساس بن کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر شنکر حواس بجا نہ رکھ سکا۔ بس بچھر گیا ——— بس۔ ختم ——— !

ایک عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب بھی مس صاحب ڈاکٹر شنکر کو علاج کیلئے بلاتیں۔ ڈاکٹر شنکر اطلاع ملتے ہی ——— اکثر نہایت عجلت کے ساتھ۔ ریلوے ہوٹل کی طرف چل پڑتے۔ چند منٹ میں وہاں پہونچ جاتے جہاں بندر اور ڈاکٹروں کے سوا اور کوئی نہیں پہونچ سکتا تھا جب وہ آتے بندر کمرے سے باہر نکال دیا جاتا۔ جب ڈاکٹر واپس مطب میں چلا جاتا تو بندر کمرے میں چھوڑ دیا جاتا۔ اس ترتیب عمل کے بعد مس صاحب کی طبیعت باہر کی دنیا کے لئے اچھی ہونی شروع ہو جاتی۔ اگر یہ "وزٹ" شام کے وقت ہوئی ہے تو وہ ساری رات آرام سے سوتیں۔ بستر پر بندر کو لٹا لیتیں اور اسے خوب زور سے بھینچکر پیار کرتیں اور دونوں کھیلتے کھیلتے سو جاتے۔ وہ اچھی ہونے کے بعد شام کو سرکاری باغ میں، جو پاس میں تھا، ٹہلنے کے لئے چلی جایا

کرتی تھیں. ہوٹل کے لوگ یا بستی والے اگر ان کے بارے میں کچھ کہتے سنتے تو اس کی انہیں کوئی پروا نہ تھی۔

ہر شخص کو علم تھا کہ مس صاحب کے پاس ہوٹل کا کونسا کمرہ ہے۔ اس کا ایک دریچہ ترکاری کی منڈی کی طرف کھلتا تھا۔ یہ ترکاری کی منڈی ہوٹل کے عین نشیب میں تھی ادھر ادھر سبزی کی اور پھلوں کی دکانیں تھیں. کچھ موزے بنیان والے اور بابو لوگوں کو ان کی بچی کھچی تنخواہوں کے بوجھ سے اور بھی ہلکا کر دینے والے "جنرل مرچنٹوں" کی دوکانیں تھیں. بندر بھی اکثر اس کھڑکی میں آجاتا تھا اور اچھلتا کودتا رہتا تھا.

بندر تھا بڑا بدمعاش. بلیوں اور کتوں کا اس نے ناک میں دم کر دیا تھا. وہ نیچے سے پھل چرا کر لے جاتا تھا. کبھی غصہ میں آ دھے کترے ہوئے پھل اٹھا اٹھا کر راہگیروں اور اس کے کام میں مداخلت کرنے والے دوکانداروں کے تاک تاک کر مارا کرتا تھا. بستی کے لوگ اس طاعون سے سخت نالاں تھے مگر اس کی ہنسانے والی باتوں سے کبھی کبھی خوش بھی ہو جایا کرتے تھے. لیکن سب لوگ اس بندر اور اس کی مالک پارسن اور کھڑکی کو خوب پہچانتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ساری بستی اس ہنگامۂ عشق سے واقف تھی۔ سب جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر لوگ کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے

تھے بعض لوگ اچھی طبیعت کے ہوتے ہیں اور چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں کہ برائی ہو رہی ہے تو ہونے دو ہم تو الگ ہیں۔

مایا کو بھی کوئی پروا نہ تھی گو اُسے سب کچھ معلوم تھا کہ پارسن لڑکی سے ڈاکٹر صاحب کا کیسا التفات ہے لیکن وہ طے کر چکی تھی کہ جب تک اُسے مجبور کر کے نہیں بتایا جائے گا اس وقت تک وہ بھی کچھ نہیں کہے گی۔

مگر ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک واقعہ ہو گیا! واقعات ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ آپ کو یہ یقین ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ کسی تردّد کی ضرورت نہیں ہے اور سب کام حسب منشا ہو رہے ہیں کہ یکایک کچھ رونما ہوتا ہے، ایک غبارہ کا ایک دم سے اوپر آسمان کی طرف جاتا ہے اور وہاں جا کر پھٹتا ہے۔ سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ کچھ کیا ہو رہا ہے!

اس موقع پر چند واقعات اتفاق سے یکجا ہو گئے جس نے معاملے کو ختم ہی کر کے رکھ دیا۔ ڈاکٹر شنکر نے گھر کا سب سامان باندھا۔ اپنا مطب وطب اونے پونے بیچا، اپنی بیوی اور تین بچے لیکر وہ کسی دوسرے شہر میں چلے گئے!

سب سے پہلی چیز تو یہ تھی کہ ان کو لڑائی کے بعد سے ٹیونک کوٹ پہننے کا خاص شوق پیدا ہو گیا تھا۔ فاختئی رنگ کی چوڑی دھاریوں والی پتلون ان پر بہت جچتی تھی، اور وہ اُسے اکثر پہنا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ پارسن لڑکی جس کمرے میں رہتی تھی اُس کی کھڑکی سب پہچاننے لگے تھے، کیونکہ وہ بازار کی طرف کھلتی تھی۔
تیسری چیز بندر تھا۔

جس وقت ڈاکٹر شنکر آتے تو حکم کے بموجب بندر کو کمرے کے باہر دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس خاص موقع کے دن چالاک بندر پہلے ہی سے کمرے کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا، نوکر دن نے اُسے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب وہ نہیں ملا تو اطمینان سے کمرہ بند کر دیا گیا۔ اور لوگ بھول گئے کہ بندر تھا کہ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا خبیث جانور بڑا جلتا ہے بعض باتوں سے۔

بہر حال کچھ بھی ہوا ہو واقعہ مختصر طور پر یہ ہے:۔

شام کے کوئی چار بجے تھے۔ شام کے وقت سبزی والوں کی دُکانوں پر اور جوہری والوں کے تختوں کے سامنے بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ سارے شہر کا آدمی وہیں چیزیں خریدنے آتا ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ ساری بستی اس وقت وہاں موجود تھی، اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اب سورج ڈوبنے کے قریب ہو چلا تھا۔۔۔ دکانداروں کی زبانیں انجن کے پسٹن کی طرح چل رہی تھیں۔ خریداروں کے ہاتھ جیبوں میں جاتے تھے اور دکانداروں کے ہاتھ سے مصافحہ کر کے "تہی دست" واپس آتے تھے۔ لوگ بہت مسرور اور شاداں تھے۔ تہوار آنے والا تھا۔ طرح طرح کی رنگین اور

گراں قیمت چیزیں خرید رہے تھے۔ باتیں کر کر کے گرانی کے خیال کو
دل سے مٹا رہے تھے۔ دکاندار اس گفت و شنید میں برابر کا حصّہ
لیتے تھے تاکہ خریداروں کو گرانی کا احساس کم از کم بازار میں تو نہ ہونے
پائے۔ یہ "اپلائیڈ سائیکالوجی" بازار کے دکاندار کانٹ اور ہیگل کو
پڑھے اور جانے بغیر بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

یہ سب کچھ بازار میں ہو رہا تھا کہ یکایک ایک خاموشی سی چھا گئی۔ سارا
چوک ریلوے ہوٹل کے ایک خاص کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف
دیکھنے لگا۔ چہروں کا ایک مستقل سمندر تھا جو اس وقت ریلوے ہوٹل کی
طرف دیکھ رہا تھا۔ آگ لگ گئی تھی کیا۔ نہیں، پھر بھی لوگ دیکھ رہے تھے۔
سب گھور رہے تھے۔

اس کھڑکی میں یکایک بندر نمودار ہوا۔

ڈاکٹر شنکر کی زرد موٹر ریلوے ہوٹل کے باہر کھڑی ہوئی تھی حسب
معمول لوگوں نے یہ سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب یا تو ہوٹل میں ہیں یا اس کے
آس پاس۔

بندر کوئی چیز کھینچکر باہر لا رہا تھا۔ کھینچنے کی حالت سے معلوم ہوتا تھا
کہ جس چیز کو وہ کھینچکر باہر لا رہا ہے قطعی طور پر بھاری ہے۔ یا اس کا سنبھالنا
تو مشکل سے ہی۔ وہ کھڑکی میں سے منہ نکال کر جھکا۔ پھر مجمع کو دیکھکر منہ
پھیر کر کھڑا ہو گیا اور برابر جھکے گیا۔ وہ اسقدر جھکا کہ اس کا سارا جسم اس
چیز میں چھپ گیا، یہ چیز دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی لباس کی قسم

سے ہے۔ یکایک بندر کا ہاتھ اس چیز کو جس میں وہ لپٹ سا گیا تھا چیرتے ہوئے باہر نکلا اور وہ جھونیوں کی طرح پھر پھیکا۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور وہ مع اس کپڑے کی گٹھڑی کے نیچے آپڑا۔ لوگ دوڑ میں دوڑیں کہ بندر نیچے گر کر مر چکا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ لوگوں نے اس کے زخمی جسم سے بڑی مشکل سے اس کپڑے کو چھڑایا۔ سب جمع ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ بندر کس چیز میں پھنس کر نیچے گرا ہے۔

کبھی لوگ بندر کی طرف دیکھتے تھے، کبھی کھڑکی کی طرف، کبھی کار کی طرف۔ اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔ ساری چوک کی پبلک اس چیز کو دیکھنے کیلئے ریلوے ہوٹل کے نیچے پارسن کی کھڑکی کے نیچے جمع ہو گئی۔

+ + +

یہ ڈاکٹر شنکر کی پتلون تھی!

پہلی شب

گیلری میں تیسری قطار کی آخری نشست پر ایک نوجوان بیٹھا ہے
اُس کے قریب ہی ایک لڑکی ہے۔ یہ نوجوان اُس کے ساتھ "مجنوں"
کا پارٹ ادا کر رہا ہے اور اس قدر وارفتگی کے ساتھ کہ گیلریوں میں
یہ شدت احساس بالعموم نہیں دیکھی جاتی۔ ایسی باتیں لوگ بکسوں میں
کیا کرتے ہیں۔

نوجوان کا بایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل ہے، وہ کبھی کبھی
اس ہاتھ کی انگلیاں لڑکی کی پشت اور کندھوں پر کبھی اوپر اور کبھی
نیچے کی طرف بھی لے جاتا ہے، یہ جنبش متواتر ہو رہی ہے جیسے کوئی مستعد
سنتری کسی تنگ گلی میں گشت لگا رہا ہو۔

اس کا دایاں ہاتھ لڑکی کی گود میں ہے اور کبھی کبھی اس کرخت
لفافہ کی جس میں تلے ہوئے بادام بھرے ہوئے ہیں، ایک آواز سُنائی
دے جاتی ہے۔ دونوں کی انگلیاں جب شوخی سے ایک دوسرے کو
چھو جاتی ہیں تو ایک عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ وہ باداموں
کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی انگلیوں سے کھیلنے اور ایک عجیب مسرت

محسوس کرنے لگتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ذائقہ زیادہ قوی حس ہے یا لمس ــــ!

لڑکی اس قدر شستہ اور بجلی ہے کہ ایکٹرس کبھی نہیں بن سکتی اس لئے یہ مقدر ہو گیا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک "تماشائی" بنی رہے.

لڑکی چڑیا کی طرح سکڑ کر کرسی کے ایک رخ پر ہو گئی حالانکہ اُسے سکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ جب پھیلی ہوئی بیٹھی تھی تب بھی کرسی کی ایک بڑی وسعت رائیگاں ہو رہی تھی. معلوم نہیں نوجوان لڑکیاں جب جوانوں کے نزدیک تر ہوتی ہیں تو کرسی سے زیادہ دوسروں کے گوشت پر گرنا کیوں زیادہ پسند کرتی ہیں! وہ اور سکڑی اور اپنی انگلیاں بے خیالی میں دیکھنے لگی، گویا اس کی انگلیاں اس سے پہلے اس کے جسم پر نہیں تھیں اور یکایک پیدا ہو گئی تھیں. وہ اس وقت ایسی معلوم ہو رہی ہے جیسے بلّی زمین پر گرنے سے پہلے اپنے پنجے پھیلا دیتی ہے.

لڑکی کا سفید ہاتھ، جو دیکھنے تک میں ٹھنڈا ہے، کبھی کبھی کرسی کے بازو پر جم جاتا ہے. وہ جب ان سب حرکتوں سے تنگ آجاتی ہے تو اپنے دونوں ننھے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لئے باہم ملنے لگتی ہے جیسے دو پرند ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے دور تک تیرتے چلے جا رہے ہوں.

کبھی کبھی اس کا حسین ہاتھ سر تک بلند ہوتا ہے اور سنہری بالوں

کی ان لٹوں کو، جو چشم و ابرو کے سٹیج پر ہلتے ہوئے پردے کی طرح لٹک آتی ہیں، ایک طرف ہٹانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں آئینہ بن جاتی ہیں جن میں اسٹیج معکوس ہوتا ہے۔ کبھی ان میں بجلی کے قمقمے جو اندرِ دل کے دروازے میں جلتے ہیں منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب سے زیادہ اندرونی شعلوں کی ایک دمک ان میں دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ لڑکی کے فانوسِ روح میں اُلفت کی ہزاروں شمعیں روشن ہیں۔

یہ نوجوان اس حسین لڑکی پر مفتوں ہے اور بُری طرح گرویدہ ہے۔ وہ اُسے تھیٹر لایا ہے پھر اُسے گھر تک پہونچانے جائے گا۔ وہ اکثر شام کے وقت اُسے کہیں کہیں لے جاتا ہے اور اس کے ساتھ زیادہ رات تک رہنے کے لئے دُور دُور کے راستے اختیار کرتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اُس کی آئس کریم کی پیالی یا کوفی، دانستہ طور پر جلدی ختم ہو جائے۔ لڑکی اس سے وعدہ کر چکی ہو کہ میں ہمیشہ تیری رہونگی اور ساری عمر تیرے ہی خیال میں بتا دونگی۔

وہ جب کبھی اس نکیلی لڑکی سے ملنے آتا ہے پہلے اُسے اپنی آغوش میں لیتا ہے اور پھر نہ جانے کیوں اُسے بھینچنے لگتا ہے اور وہ اکثر زندگی کے تجربات کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں، زندگی کے تمام فریبوں کو جو حقیقت معلوم ہوتے ہیں اور ان تمام حقیقتوں کو جو بعد میں فریب نکلتے ہیں، وہ خوب دیکھتے اور سمجھتے رہتے ہیں۔ اسٹیج پر

سینما اور اسی قسم کی دیگر مسرتیں جو دنیا اُن کی وارفتگی کو مہمیز دینے کیلئے پیش کرتی رہتی ہے یہ اُن کی دل کھول کر داد دیتے اور برابر اُنہیں قبول کرتے رہتے ہیں۔

یہ پہلی رات ہے۔۔

کھیل ایک مشہور اور زندہ جاوید تمثیل نگار کا لکھا ہوا ہے۔ دُنیا اُمڈی چلی آرہی ہے اور اس جست وخیز میں مصنف کی ہستی نیم مُردہ سی ہو چکی ہے، اُس نے یہ ڈرامہ ایک نہایت اہم موضوع پر لکھا ہے، اس کا یہ چار ایکٹ کا ڈرامہ اسٹیج کی تین دیواروں کے درمیان آج پہلی شب کو کھیلا جا رہا ہے۔

ملک کے اس مشہور وطباع تمثیل نگار کے لکھے ہوئے کھیل کو تنقید اور نکتہ چینی کی نظر سے دیکھنے کے لئے ہندوستان کے بہترین ادیب اور نقاد جمع کئے گئے ہیں، اس "مقدس" فرض کے ادا کرنے والوں کے لئے اسٹیج کے سامنے والے سٹال مخصوص کردئے گئے ہیں۔ فن کے نقاد کھیل کی جزیات پر کڑی نظر لگائے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ زندگی سامنے اسٹیج پر ہے، حالانکہ انہیں اس کی خبر نہیں کہ وہ تو اُن کی پشت پر ہے۔ حقیقی ناٹک تو ادھر ہو رہا ہے۔ نقادوں کو کیا معلوم ہے کہ زندگی کا "کچا مال" جس سے کارخانۂ حیات میں چیزیں ڈھلتی ہیں پیچھے انبار در انبار چلا گیا ہے۔ وہ صرف سایہ کو دیکھتے ہیں کیونکہ اصل کی نسبت سایہ کے حسن وقبح پر نازک طبعی اور تنقیدی قابلیت کے

دانت زیادہ روانی کے ساتھ تیز کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نقّاد ایسے ہی بے خبر ہیں، زندگی کے اصل ناٹکوں سے جیسے وہ لڑکی جو گیلری کی تیسری قطار میں بیٹھی زندگی کے اسٹیج پر "محبت" کا "منظر" پیش کر رہی ہو گو وہ اسقدر رعنا نہ سہی جیسی اسٹیج کی مثلہ ہو مگر پُر خلوص تو ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنی ایک ٹانگ اُٹھا کر دوسری ٹانگ پر رکھ لیتی ہے، ایسا کئی بار ہو چکا ہے اور اس میں ایسا بھی ہوا ہے کہ اس کی پیازی ساری اُٹھ جانے سے ایک گداز و نفیس تختہ بہت دور تک عریاں ہو گیا، ایسا ہوتے ہی اسکے دونوں ہاتھ —— جو اسوقت اخلاق سے زیادہ گوشت کے محافظ و پردہ پوش بنے ہوئے ہیں —— بار بار ساری کے گھیر کی طرف بڑھتے ہیں اور اس "معجزۂ لحمی" کو جو بجلی کی طرح چمک گیا تھا پھر ستر کے بادلوں میں چھپا دیتے ہیں!

لڑکا یہ چاہتا ہے کہ یہ کام وہ کر دیا کرے مگر لڑکی نے اسکے ہاتھ اپنی گود میں رکھ لئے ہیں اور اُن سے کھیلے جا رہی ہے۔ نوجوان آنکھیں پھاڑے بڑی توجہ سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھے جا رہا ہے جیسے وفادار کُتّا اپنے مالک کو دیکھے ہی جاتا ہے۔ دیکھے جانے کی یہ بے بسی بھی کیا چیز ہے۔

اُن دونوں کے ارد گرد معمّر مرد ہیں اور نوجوان عورتیں جوان مردوں کے ساتھ بادلِ ناخواستہ بندھی ہوئی ہیں مگر اس جنون میں مبتلا ہیں کہ حُسن کو تا ابد کس طرح قائم رکھا جائے۔ یہ چکنے گھڑے عمر کو دھوکا دینے کی فکر

میں رہتے ہیں، خود تماشے کی پتلیاں ہیں مگر دوسروں کا تماشہ دیکھنے کی ہوس میں کس قدر بیتاب. یہ عورتیں اور مرد اپنی ٹانگوں پر ٹانگیں، اور برابر والوں کی کرسیوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں. کبھی کبھی جمائیاں لیتے ہیں کبھی دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگتے ہیں. یہ تہذیب انہیں سکھاتی ہے کہ جب خوش ہو تو دونوں ہاتھوں سے تالی بجاؤ، لیکن نئی حکمتیں بھی ابھی تک یہ راز معلوم نہ کر سکیں کہ ایک ہاتھ سے تالی کیوں نہیں بجتی، ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پہ گرنے کیلئے کیوں مجبور ہے؟ آدمی بعض مقامات پر پہونچکر کس قدر بے دست و پا ہو جاتا ہے؟

اس ناٹک کے تماشائیوں میں صرف یہ لڑکا لڑکی ہی خالی بیٹھے ہیں. وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں سے کھیلے جا رہے ہیں ـــــ یا نجانے کیا کر رہے ہیں ـــــ مجھے اندھیرے میں زیادہ دیکھنے کی مہارت بھی کم ہے ـــــ لیکن کم از کم ان دونوں کے ہاتھ اظہار تحسین کیلئے بالکل استعمال نہیں ہو رہے. گو باقی "سمجھدار" لوگ جو تماشے میں منہمک ہیں آنکھوں اور دماغ سے زیادہ اپنے ہاتھوں کو کام میں لا رہے ہیں. یہ جوڑا اپنا ناٹک الگ کھیل رہا ہے مگر اس تماشے کے دیکھنے والے کوئی نہیں ہیں. اس لئے خواہ وہ کتنا ہی اچھا ناٹک کیوں نہ ہو ایک تالی بھی نہیں بجیگی. نوجوان کے ہاتھ مسلسل ایک حرکت و رقص میں مبتلا ہیں، یہ عمر بھر کی چکی ہے اور قید حیات کی سزا کے طور پر اپنے جیون ساتھی کی ہمراہی میں پیسنی ہی پڑے گی.

سوائے میرے اُن کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہو اور نہ اس جوڑے میں کوئی غیر معمولی بات ہو جس کی طرف کوئی متوجہ بھی ہو سکے، ایک معمولی حیثیت کے دو مرد عورت ہیں اور بس. ایک طرف بیٹھے ہیں بیٹھا رہنے دیجئے. لوگ انہیں بالکل نظر انداز کر چکے ہیں اور اُن کی سمجھ کے اعتبار سے یہ اندازہ ٹھیک ہی ہے.

مگر یہ کسقدر عجیب اتفاق ہو کہ ایسے بہت سے ناٹک ہم اپنے اردگرد دیکھتے رہتے ہیں مگر کوئی توجہ نہیں کرتے.

بالکل ایسا ہی اس خوبصورت جوڑے کے ساتھ بھی ہوا.

کسی نے آج تک اُن پر ایک سطر بھی نہیں لکھی!

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ننھے ننھے ناٹک شائستۂ اعتنا اور قابل تحریر بھی ہیں یا نہیں؟

* * *

اگر ہیں تو کیوں ہیں، اور نہیں تو کیوں نہیں؟!

چند لمحے[1]

(ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ)

افراد

جواد:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان۔
عفیفہ زمانی:۔ ۔ ۔ ۔ ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی۔
ناصر:۔ جواد اور عفیفہ کا مشترک دوست جو پہلی بار عفیفہ کا تعارف جواد سے کراتا ہے۔
ایک چھوٹی لڑکی:۔ جو "آئس فروٹ" بہت کھاتی ہے۔
ایک آواز:۔ "آئس فروٹ" والے کی جو پس منظر سے چھوتی لڑکیوں کو تحریص دیتی رہتی ہے۔

وقت:۔ شام کو پانچ بجے مقام:۔ جواد کا ڈرائنگ روم

(پردہ اٹھتا ہے)

جواد اپنے ڈرائنگ روم میں ہے جو مشرقی و مغربی آرائش

---

[1] ع:۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔

سے سادگی کے ساتھ آراستہ ہے۔ بیچ میں ایک صوفے پر
عفیفہ زمانی ایک خاتون ہے۔ جس کا لباس مغلئی خیالی کا ایک
نمونہ ہے۔ ڈھیلا پاجامہ اس پر باریک کریب کا چست کرتہ
اور آنکھوں میں طور کو شرمانے والا دنبالہ دار سرمہ۔ اُسکے
دائیں جانب ایک غیر معمولی طور پر شکیل نوجوان ہے۔ یہ
جوّاد ہے۔ عفیفہ زمانی کے بائیں جانب ایک اور لڑکا ہے۔
اس کا لباس معمولی ہے مگر ستھرا۔ بالخصوص اس کی شیروانی
بہت نفیس اور جوتے نہایت سیاہ ہیں۔ ایک چھوٹی بچی
عفیفہ زمانی کے سے کپڑے پہنے کمرے میں ناچی ناچی
پھر رہی ہے۔ کبھی تصویروں کو دیکھتی ہے، کبھی البم اٹھاکر
اُسے دیکھتی ہے اور اپنے خیال میں مگن ہے۔ بازار میں
'آئس فروٹ' والا بولتا ہے تو عفیفہ زمانی سے آپا کہہ کر
مخاطب ہوتی ہے اور اس سے پیسے مانگتی ہے۔ عفیفہ اپنی
مٹھی کھول کر کچھ پیسے ایک پڑیا میں سے نکالتی ہے۔ جس
کی ندرت پر جوّاد اور جوّاد کا دوست ناصر ایک دوسرے
کی طرف دیکھکر مسکراتے ہیں۔)

ناصر۔ جوّاد، یہ آنسہ عفیفہ زمانی ہیں، ان کا غائبانہ تعارف تو کئی بار کرا
چکا ہوں۔ آج یہ خود تم سے ملنے تشریف لائی ہیں۔

جوّاد:۔ (تعظیماً جھکتا ہے) تسلیمات عرض ہے۔

عفیفہ زمانی:۔ مجھے آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا۔
جواد:۔ یہ آپ کی نوازش ہے۔
عفیفہ زمانی:۔ میں نے "اسلامک یونیورسٹی" سے اُردو میں ایم۔اے کیا ہے۔
جواد:۔ اس کا تو مجھے پہلے ہی علم ہے۔ اس وقت تکلیف فرمائی کی کوئی خاص تحریک تھی کیا؟
عفیفہ زمانی:۔ (بے پروائی سے) جی نہیں۔ ہم تو ایسے ہی ملنے جلنے کے عادی ہیں۔ آج سوچا کہ آپ سے ہی چل کر......
ناصر:۔ (ہنستے ہوئے) دل بہلائیں!
جواد:۔ آپ کے حسنِ انتخاب پر مجھے کلام ہے۔ دراصل میں ویسے بھی ملنے جلنے کا چور ہوں اور جدید عورت سے تو میں ذرا کھنچا ہی رہتا ہوں کیونکہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ وہ نسائی خصوصیات سے محروم ہوتی جارہی ہے۔
عفیفہ زمانی:۔ (جھنجلاتے ہوئے) یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہوں۔ لوگ خواہ مخواہ مجھے تنگ کرتے ہیں یقین کیجئے آپ نے میرے بارے میں جو کچھ سُنا ہے وہ سب غلط ہے۔ لوگ جدید لڑکیوں کو، بالخصوص جن میں کچھ شعری یا ادبی رجحان ہو، خواہ مخواہ بدنام کیا کرتے ہیں۔ میں ایسی لڑکی ہوں کہ مرد مجھ سے خلوت برت سکتا ہے۔ مرد مجھ پر بھروسہ کرسکتا ہے، سچائی کے ساتھ۔

جواد:۔ (ذرا لطافت کے ساتھ) میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی عورت، میرا مطلب اس عہد کی عورت سے ہے، سچائی اور ایمانداری برداشت ہی نہیں کر سکتی۔

عفیفہ زمانی:۔ واہ! یہ آپ نے کیسے کہہ دیا؟ کیا کبھی کسی لڑکی سے آپ نے سچی محبت کی ہے؟ کیا ایمانداری مرد ہی برت سکتا ہے، عورت نہیں برت سکتی۔

جواد:۔ جی ہاں، میں نے کئی بار لڑکیوں کے ساتھ اخلاصِ قلب کا ناطہ جوڑنا چاہا مگر نتیجہ ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا۔

عفیفہ زمانی:۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے غلط لڑکیوں کا انتخاب کیا۔

(جواد عفیفہ کی طرف دیکھتا ہے جس کی نظریں شاید یہ کہنا چاہتی ہیں ــــ "مجھے کیوں موقع نہیں دیا"ــــ!)

جواد:۔ اوں ــــ آہم!

عفیفہ زمانی:۔ (یہ محسوس کرتے ہوئے کہ جواد شکست کھا گیا ہے اونچے پُرجوش لہجے میں) جب ہی تو میں یہ اصرار کرتی ہوں کہ مرد میں محبت کرنے کے لئے دیانت ہونی چاہیئے۔ اگر مردوں میں یہ خصوصیت نہیں ہے تو وہ محبت کا نام بھی نہ لیں۔ میں مطالبہ کرتی ہوں مردوں سے کہ وہ مخلص ہوں۔ میں اپنے دوستوں میں یہ خوبی دیکھنے کی متوقع ہوں۔

جوّاد:۔ (طنزاً نہیں مگر سرد مہری کے ساتھ) دوستوں سے آپ کی کیا مُراد ہے؟

عفیفہ زمانی:۔ (دانتوں سے ناخن چبا کر پریشانی دُور کرتے ہوئے) دوست؟ —— دوست سے میرا مطلب ہے مدّاح۔

جوّاد:۔ (تیزی سے) تو پھر عاشق کہئیے —— نہ ——؟

عفیفہ زمانی:۔ یہ تو بہت غیر شاعرانہ لفظ ہے۔

جواد:۔ ہم معنی لفظوں کے فرق سے معنویت میں خبط نہیں پیدا ہوتا۔

عفیفہ زمانی:۔ (جز بز ہو کر) اچھا خیر یہی کہہ لیجئے۔

جوّاد:۔ جی۔ بیشک۔

(چھوٹی بچّی اپنی بہن کو گفتگو میں مصروف پاکر مختلف شرارتیں کرنی شروع کرتی ہے، جس سے انکی گفتگو میں خلل پڑتا ہے لیکن وہ گفتگو جاری رکھتے ہیں۔ بعض اوقات بچّی کی باتوں سے جو وہ ناصر کے ساتھ کر رہی ہے، ایک دوسرے کی بات آسانی کے ساتھ سُن بھی نہیں سکتے۔

یکایک بچّی ایک کرسی پر چڑھ کر کسی تصویر کو دیکھنے کے لئے پھُدکتی ہے کہ کرسی پھسل جاتی ہے اور وہ گرتی ہے۔ ناصر "ارے ارے!" کہہ کر جلدی سے لپکتا ہے اور اُسے بچا لیتا ہے۔ اس موقع پر بچّی ناصر کے گلے میں ہار کی طرح لپٹ جاتی ہے اور طرح طرح کی پکّی باتیں شروع کر دیتی

ہے جس پر جوّاد بہت چیں بہ جبیں ہو کر مگر بہ ظاہر خندہ پیشانی
سے کہتا ہے۔)

جوّاد:- معاف کیجیے گا۔ یہ لڑکی بہت لاڈلی ہے آپ کی۔

ناصر:- یہ آپ کی چھوکری بہت ہی شریر ہے۔

عفیفہ زمانی:- (ذرا مضطرب ہو کر دونوں طرف دیکھتے ہوئے۔) یہ
میری لڑکی نہیں ہے۔ چھوکری بھی نہیں ہے، یہ تو میری بہن ہے۔
چھوٹی بہن۔

چھوٹی بچی:- نہیں ۔۔۔ بھائی ہوں ان کا!

(اس پر سب مل کر ہنستے ہیں، اسی اثنا میں باہر سے
"آئس فروٹ" بیچنے والے کی آواز سنائی دیتی ہے اور
ناصر بچّی کو اٹھا کر باہر لے جاتا ہے۔)

ناصر:- آؤ ننھی باہر چلیں۔ باجی کو باتیں کرنے دو۔ ہم تمہیں مٹھائی دلوائیں گے۔

ننھی بچی:- ہمیں آئس فروٹ اور دلوائیے۔

(دونوں باہر جاتے ہیں۔ جوّاد اور عفیفہ تنہا رہ جاتے ہیں
اور بہت کھل کر باتیں شروع کرتے ہیں۔)

عفیفہ زمانی:- ہاں! تو میں کیا کہہ رہی تھی۔ ہاں میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں
کس قدر صاف گو اور حق پسند ہوں۔ میری جگہ اگر کوئی اور لڑکی
ہوتی تو بھلا یہ اعتراف کر لیتی۔

جوّاد:- یہ بھی ایک حربہ ہے!

عفیفہ زمانی۔ آپ نیٹشے کے مرید معلوم ہوتے ہیں. عورتوں کی طرف سے
بہت ہی بدگمان ہیں. میں تو کہتی ہوں کہ مرد ہی ایمانداری نہیں
برت سکتا. عورت پر ناحق الزام لگاتا ہے. میں تو جس مرد سے
اخلاص برتتی ہوں پوری طرح برتتی ہوں. لیکن مرد مجھے بدنام
ہی کرتے ہیں.

جواد۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے. مگر آپ کو یہ تجربہ محض اس وجہ سے
ہوتا ہوگا کہ جب کبھی کسی دوسرے مرد سے ملتی ہونگی پہلے مرد کی
بُرائی کرتی ہوں گی. اس سے کہتی ہوں گی کہ وہ ذرا "بڑھ رہا تھا.
مجھ سے بے تکلف ہوا چاہتا تھا کہ میں نے اسکے منہ پر طمانچہ مارا." اور
یہ کہہ کر اس نئے مرد کے گلے میں تم باہیں ڈال دیتی ہوگی.

عفیفہ زمانی (جھلاکر) واہ! آپ تو مجھے چھیڑنے لگے!
(جواد ذرا مربیانہ انداز میں اس کی طرف دیکھکر مسکرا دیتا ہے
اور پھر پیپر ویٹ سے کھیلنے لگتا ہے)

عفیفہ زمانی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں کسی سے دغا نہیں کرتی.
(جواد کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے)

عفیفہ زمانی:۔ (اپیل کے گلوگیر لہجہ میں) آپ کو یقین نہیں ہے.

جواد۔ مجھے یقین ہے. ممکن ہے آپ درست کہہ رہی ہوں. مگر میں جو بات
کہہ رہا ہوں وہ بھی غلط نہیں ہے. آپ یقین کیجئے کوئی عورت وفادار
نہیں ہوتی مجبوریاں اُسے پابند وفا بنائے رکھتی ہیں!

عفیفہ زمانی :۔ (ہلکی سی چیخ کے ساتھ) ارے بغضب خدا کا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تعجب ہے۔ آج تک کسی ڈرائنگ روم میں ایسی فرسودہ اور وحشیانہ بات سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

جواد :۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ واقعہ ہے۔

عفیفہ زمانی :۔ لیکن آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ کیا ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتیں ایسی ہونگی جو سچی محبت کرنا چاہتی ہیں، دل سے خواہشمند ہیں، مگر وہ انہیں نہیں ملتی محض اس وجہ سے کہ اُن کی ہمت نہیں ہوتی کیونکہ مَردوں نے عورتوں کو اپنے رویہ سے ڈرا رکھا ہے۔ مَردوں میں بھی کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر عورت بھروسہ کر سکتی ہے۔ سچی بات بتانے اور دلی عشق کا اظہار کرنے کے لئے، معاف کیجئے گا، آپ مَردوں نے اخلاق کے دو معیار بنا رکھے ہیں۔ ایک عورتوں کے لئے دوسرا مَردوں کے لئے۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور مَیں بھی جانتی ہوں۔

جواد :۔ میرے ذہن میں اس وقت وہ مرد نہیں ہیں جنہیں غیر معمولی یا روائتی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ صرف عام مَردوں کو لیتا ہوں جو زندگی کو بالکل عیاں حالت میں دیکھتے ہیں اور نہ صرف پاک وصاف حقیقت کو ہی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ جن کے نزدیک جذباتِ قلب جسم کے ایک فطری میلان کا نام ہے۔

جو جذبات کے معاملے میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں برتتے۔
جس راستے پر وہ آزادی کے ساتھ چلتے ہیں عورت کو بھی اپنے
ہمراہ لے لیتے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ایسے مردوں کے ساتھ بھی
عورتیں وفا نہیں کرتیں۔ میں جانتا ہوں اس چیز کو۔ میں مانتا ہوں
اس بات کو کہ عورتوں نے میرے ساتھ وفا کوشی کا اظہار کیا۔ سچّی
محبت کرتی رہیں، مگر آخر کار وہ اُسے نبھا نہ سکیں۔ اور دیانتِ عشق
میں وہ پوری نہ اتریں۔

عفیفہ زمانی:۔ (سر کا دوپٹہ بلا وجہ گرا کر پھر اُسے متانت کے ساتھ ٹھیک
کرتے ہوئے) کیا خوب!

جواد:۔ (اسی جوش سے) جی ہاں۔ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ بلکہ میں تو یہ
سمجھتا ہوں کہ عورت میں کوئی فطری رجحان ایسا ہوتا ہے کہ وہ اُسے
اس طرح کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جب عورت مرد کو پھانس لیتی ہے
تو اس کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس فریبِ نفس کو، اس
سرابِ تصوّر کو، وہ ہاتھ سے نہ جانے دے اور اس سحر کو برقرار
رکھنے اور مرد کو مجبورِ ناز رکھنے کیلئے پھر دنیا کا کونسا حربہ ہوتا ہے
جو عورت چھوڑ دیتی ہے۔ بعض مستثنیات بھی ہوتی ہیں — آپ
ان میں سے نہیں ہیں!

عفیفہ زمانی:۔ اوہ! معاف کیجیے، آپ تو ذاتیات پر اُتر آئے۔ خدا کیلئے
ایسے کلمات مُنہ سے نہ نکالئے آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔

جواد:۔ اچھا! یہ بات ہے! یہ لباس جو آپ پہنے ہوئے ہیں ـــــ میرا مطلب
تمام قسم کے نسوانی لباسوں سے ہے ـــ کیا ہے؟ کیا مکر نہیں ہے۔
کیا دھوکے کی ٹٹی نہیں ہے۔ کیا یہ وہ جال نہیں ہے جس میں آپ
مرغ مذکور کو پھانستی ہیں۔ یہ آپ کا کرتا اس قدر باریک کریب کا
کیوں ہے۔ محض اس وجہ سے نا کہ اندر کا "باڈیس" دکھائی دیتا
رہے۔ یہ پھنسا ہوا "باڈیس" یہ جسم سے پیوست کھال کے رنگ
کی "انڈیز" (ولائتی چولی) اور دیگر آرائشی لباس آخر مرد کے لئے
آلاتِ حرب کی نمائش نہیں تو اور کیا ہے۔ اور یہ آپ کا بار بار ہاتھوں
کو شانوں سے اوپر اٹھا کر دوپٹہ ٹھیک کرنا سینہ کی......
عفیفہ زمانی:۔ (بات کاٹتے ہوئے اور بہت بے چینی سی محسوس کر کے ذرا احتجاجاً)
خدا کے لئے! یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔
جوّاد:۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید آپ ایمانداری کی بات سن سکیں گی۔ مگر نہیں۔
سچ کڑوا ہی ہوتا ہے۔
عفیفہ زمانی:۔ (اکڑ کر) میں سچ بات برداشت کیوں نہیں کر سکتی۔ ضرور
کر سکتی ہوں۔ مگر آپ تو مجھے جھنجلائے دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ حیرانی
ہے کہ آپ اس قدر بے تکلف و بیباک گفتگو ایک اجنبی لڑکی کے
ساتھ کس طرح کر سکتے ہیں!
جوّاد:۔ کیونکہ میں ایک معمول سے گھٹا ہوا یا بڑھا ہوا آدمی نہیں ہوں ـــ
بیباک ہوں مکار نہیں ہوں۔ آپ کی اصطلاح میں وحشی اور

اور فرسودہ ہونا پسند کرونگا مگر اپنی اصطلاح میں مکار و فریب کار بننا پسند نہیں کرونگا۔

عفیفہ زمانی:۔ میرے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے اُردو شعرا اور ادیبوں سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں مگر کسی نے میرے ساتھ یہ بے تکلفی نہیں برتی۔ کیونکہ میں کسی کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی۔ مگر آپ تو مجھے......

جواد:۔ (بات کاٹ کر) بہت ممکن ہے وہ شعرا اور ادیب آپ کو دوستانہ پیوستگی کے سبب ہمیشہ تاریکی ہی میں رکھنا چاہتے ہوں۔ میں تو کوئی تعلق خاطر اس نوع کا آپ سے برت ہی نہیں رہا۔ پھر مُنہ پر آئی ہوئی سچی بات کیوں روکوں۔

عفیفہ زمانی:۔ (اٹھلا کر) واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ تو عورتوں کی توہین کے درپے معلوم ہوتے ہیں۔

جواد:۔ یہ الزام آپ لگا رہی ہیں۔ میں عورت کو اس کے مقام پر رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی قدرت سے زیادہ قیمت نہیں لگاتا۔ اور اس صدی میں زیادہ تر ایسی ہی عورتیں رہ گئی ہیں۔ جو بہری چنگ ہوتی ہیں۔ آج کل کی لڑکیوں نے یک گیر و محکم بگیر کے اصول کو بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ وہ ٹینس کی بال کی طرح کبھی اس بلے سے ٹکراتی ہیں کبھی اس بلے سے اور اکثر منہ کی کھا کر زندگی کے جال میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ میں نے آپ کو انہی جدید لڑکیوں میں سے پایا ہے۔

عفیفہ زمانی: آپ نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔

جواد: میں خوب سمجھتا ہوں۔ اس عہد کی لڑکیوں سے بہت آگاہ ہوں۔ اگر میں اس وقت آپ کے ہاتھوں کی خوبصورتی یا مہلک صحت دراز ناخنوں کے زیب و روغن کی تعریف کروں تو آپ دل ہی دل میں خوب محظوظ ہوں گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپنے شاید چار پانچ روز سے منہ نہیں دھویا ہے، لیکن دنبالہ دار سُرمہ محض اس لئے التزاماً لگایا ہے کہ آپ اسے بزعمِ خود کوئی موثر نسوانی حربہ سمجھتی ہیں۔ اگر میں اِن چیزوں کے باوصف آپ کے لبوں کی، آپ کی آنکھوں کی آپکی مسکراہٹ کی ذراسی بھی تعریف کردوں تو آپ ان لڑکیوں میں سے ہیں — اور اس کرۂ ارض پر اب ایسی ہی لڑکیاں زیادہ ہیں — جو پھر مرد کو اپنے پنجے سے نہیں نکلنے دیگی۔ اسے احمق بنا کر چھوڑیں گی۔ جو مرد کے سر پر سوار ہو جائیں گی۔ اگر میں ذرا سا بھی رجحان ظاہر کروں تو آپ مجھ سے مل کر بیحد مطمئن اور مسرور ہونگی — لیکن جونہی میں آپ کے .....

(یکایک وہ غصّہ میں بھر جاتا ہے اور برس پڑتا ہے)

اُف! یہی تو تم عورتوں کا مکر ہے۔ یہی تو حربہ ہے! تم یہ کھیل کھیلتی ہو اور مرد کو اس کھیل میں شریک رکھنا چاہتی ہو، جب تک کہ تمہارا دل نہ بھر جائے۔ مگر تم کوئی دوسرا کھیل بھی تو نہیں کھیل سکتیں۔ تم نے "جنس" کے جذبہ نفیس کو بدنام کر دیا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسی چیز

بنا دیا ہے کہ جسے سُن کر تمہیں شرم آنی چاہئیے ۔۔۔ یہ نوبت کیسے آئی۔ مرد نے اس میں کیا کیا۔ تم نے نئی تعلیم اور نئی نسوانی آزادی کو اپنی کرتوتوں سے موردِ الزام بنایا ہے۔ تم یونہی شہر در شہر اور شاعر بہ شاعر ماری ماری پھرتی ہو۔ تم جیسی اور عورتیں بھی ہونگی جنہیں قلم نے یا کسی اور رخشندگیٔ تہذیب نے مبہوت بنا دیا ہوگا۔ تم کو ادبی دلچسپی نے خراب کر رکھا ہے۔ تم جو کچھ کرتی ہو اس کا مورد مرد کو بناتی ہو۔ لیکن اپنی تعریف سُن کر مصنوعی شرم کی مرد آزار سُرخی کس کے چہرے پر آتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ سُرخی مرد کو خون کے آنسو رُلا سکتی ہے۔ اس لئے تمہارا کیا بگڑتا ہے کہ بناوٹی حیرت سے سانس رک کر روانیٔ خون سینہ کی طرف مائل کر دو۔ وہ آپ سے آپ مدّوجزر کا نمونہ بن جائے گا۔ یہ تم جان بوجھ کر کرتی ہو کیونکہ خوب جانتی ہو کہ مرد کو سینے سے محبت ہے۔ خواہ ماں کا ہو یا محبوبہ کا۔ وہ اس کی زد سے بچ کر نہیں نکل سکا ہے۔ تم چاہتی ہو کہ مرد وہ سب کچھ کہے جو تم سننا پسند کرتی ہو مگر یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتیں کہ تم بھی اس پر فدا ہو۔

عفیفہ زمانی :- آپ نے عورت کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔

جوّاد :- (دھیان نہ دیتے ہوئے) ـــــ کیونکہ اس طرح تمہارے نسوانی وقار کو ٹھیس پہونچتی ہے، نہ جب ہم تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں تمہیں کوئی ایسی چیز دکھائی دیتی ہے جو دل سے پسند ہے

عورتوں کو۔ مگر تم اس کا ایمانداری کے ساتھ اقرار نہیں کروگی، ہاں
۔ جان بوجھ کر سر سے دوپٹہ یا ساری کا پلّو سرکا دوگی اور اپنے غماز چہرہ
کو مرد کی مخلص نگاہوں سے بچالوگی۔ یا ناخن چبانے کی مکروہ نسوانی
عادت سے تم اپنے قلب کی بات لبوں تک آنے سے روکنے
کی سعی کروگی۔

عفیفہ زمانی:۔ کیا خوب مشاہدہ ہے آپ کا!۔

جوّاد:۔ تم اپنے جنس کی جنسی کشش ضرور محسوس کرانا چاہتی ہو مگر تام
عُمر دانستہ یا نادانستہ طور پر تم یہ فریب قائم رکھنا چاہتی ہو ـــــ
مگر اس کے ساتھ تم یہ بھی چاہتی ہو کہ مرد محسوس تو فوراً کرلے لیکن
اُسے ظاہر نہ کرے۔ خاص کر تمہارے سامنے۔ تم چاہتی ہو کہ وہ دروغ
گوئیوں اور تکلّفات کی اُلجھن میں مکڑی کی طرح پھنسا رہے۔ اگر
مرد ان باتوں کو عیاں دبے تکلّف انداز سے بیان کرنا شروع
کردے یا تم پر اُسے جتانا شروع کردے تو اس سے تمہاری توہین
ہوجاتی ہے ـــــ تم عورتوں کی توہین بھی ایک عجیب معمّہ ہے جو ابھی
تک میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔

عفیفہ زمانی:۔ میں ظاہر نہیں کرسکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کررہی
ہوں لیکن ......!

جوّاد:۔ آپ اس وقت خواہ کچھ بھی محسوس کررہی ہوں لیکن ایک لفظ ہے
جو سب پر حاوی ہے۔ آپ ہمیشہ اس چیز کا شکار رہتی ہیں اور وہ ہے

بزدلی ــــ فقدانِ جسارت!

عفیفہ زمانی:۔ (پردر دریچے میں) جی نہیں۔ اسے شائستگی کہتے ہیں!

جواد:۔ (جھلا کر) شائستگی اور بزدلی میں کیا فرق ہے؟

عفیفہ زمانی:۔ (جواد کے فقرے کا غلط مطلب سمجھتے ہوئے) مگر میں تو بزدل نہیں ہوں۔ مثلاً یہ کہ میں آپ سے بالکل نہیں ڈرتی۔ بزدلی نہیں ہے وہ چیز جو آپ مجھ میں دیکھتے ہیں۔ میری جسارت تو ہر جگہ مشہور ہے۔

(جواد یہ محسوس کرتا ہے کہ عفیفہ اس کے مفہوم کو اس طرح نہیں سمجھے گی اس لئے وہ اس ہی کی سطح ذہنی پر آکر گفتگو کرتا ہے)

جواد:۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو بھی مجھ سے خوف ہے۔

(اور یہ کہتے ہوئے جواد اچانک بیباکی کے ساتھ عفیفہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اسے گویا "ہپناٹائیز" سا کر دیتا ہے)

جواد:۔ میری طرف دیکھو۔

(عفیفہ دیکھنے لگتی ہے)

جواد:۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم جو کچھ محسوس کرتی ہو اس کو ظاہر کرنے سے گھبراتی ہو۔ یہ بزدلی ہے۔ تم اسے شائستگی کہتی ہو۔ اگر میں تم کو پسند آیا ہوں تو کیوں نہیں اس کا اقرار کر لیتیں۔ مگر تم نہیں کر سکتیں کیونکہ تم بھی اور عورتوں کی طرح بزدل ہو۔ شرمانا بھی ایک نفسیاتی

پہلو ہے کسی سے مرعوب یا خوفزدہ ہونے کا۔ کیوں ہے نا۔ دیکھو میری آنکھوں کی طرف۔ جھینپنے سے کیا حاصل ہے۔ تم تو بہت دلیر بنتی تھیں۔ نا!۔

(عفیفہ اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑانا چاہتی ہے مگر نہ جانے کیوں وہ اپنی نظریں جواد کی نگاہوں سے نہیں چھڑا سکتی۔ دونوں کے نظارے اُلجھ جاتے ہیں اور جواد ایک جھُرجھری لیکر پھر حواس میں آجاتا ہے۔)

جوّاد۔ تم میں یہ جسارت نہیں ہے کہ مجھ سے یہ کہہ سکو کہ میں نے آج تک آپ کو نہیں دیکھا تھا! آپ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں بالکل اجنبی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں لیکن اسکے باوجود میں آپ کو........

(یہ کہتے کہتے وہ اُس کے کُرتے کے بٹن کو ہاتھ سے چھونے کا محض اشارہ ہی کرتا ہے کہ عفیفہ یہ سمجھتی ہے کہ جواد میرے جسم کو چھونا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ یکایک "ہائیں یہ!" کہہ کر اچھل پڑتی ہے اور جواد اس حرکت ہو جانے کے بعد اپنا فقرہ مکمل کرتا ہے۔)

جوّاد۔ (کھنکار کر ہاتھ واپس لاتے ہوئے) دل سے چاہتی ہوں۔

عفیفہ زمانی:۔ (اپنے آپ کو بالکل پرے ہٹاتے ہوئے اور ہاتھ چھڑا کر) آپ یہ کیسی باتیں کرنے لگے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے! مجھے آخر آپ نے

کیا سمجھ رکھا ہے۔

جوّاد:۔ (طنزاً) کہئیے۔ اب وہ آپ کی جسارت کہاں گئی۔ نسوانی وقار کہاں ہے؟

(عفیفہ زمانی پر ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔)

وہ جسارت رخصت ہو گئی نا۔ جب بھی آزمائش کا لمحہ آتا ہے عورت میں دلیری کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔

(جوّاد کا موڈ بدل جاتا ہے)

پہلے تو مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ ممکن ہے آپ ایک مختلف عورت ہوں۔ دوسری عورتوں کی سی بات آپ میں نہ ہو۔ لیکن میں نے دیکھ لیا کہ آپ بھی ایسی ہی ہیں۔ میں آپ کو اپنے قریب بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔

(دروازے تک جاتا ہے اور اُسے کھول کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

تشریف لے جائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی میزبانی نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے گھر واپس جا سکتی ہیں۔ آپ مجھے فریب نہیں دے سکتیں۔ اگر میں ذرا بھی تم پر بھروسہ کر لوں تو ساری دُنیا میں بدنام کرتی پھرو گی۔ بدنام تو خیر آپ اب بھی کریں گی۔ کیونکہ میں پہلا مرد نہیں ہوں جس سے آپ نے التفات کیا ہو۔ کردہ اور ناکردہ سب ہی اعمال کی انسان کو پاداش بھگتنی پڑتی ہے۔ لیکن خیر مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ کیا کہتی پھریں گی۔ لوگ مجھ سے زیادہ آپ کو جانتے ہیں "سڑکوں کے گیت" شاید آپ ہی تو جمع کر رہی ہیں۔ چلیے،

اُٹھیئے، تشریف لے جائیے، آپ مجھے وحشی اور بدتمیز کہیں گی۔ بیشک ہوں، کیونکہ میں بُزدل نہیں ہوں۔ مجھے سستی عشق بازی سے نفرت ہے۔ مجھے ایسی لڑکی سے جو مرد کو اونٹ کی مانند ایک نکیل میں باندھنا چاہے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں آپ کو نہ آزمانا چاہتا ہوں نہ اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ آپ نے اس دفعہ بہت غلط انتخاب کیا۔ آپ کے چھل بٹے مجھ پر نہیں چل سکتے ـــــ میں صرف ایک ہی محبت کا قائل ہوں۔ بے لاگ، بے ریا، بے اختیار اور مساوی رجحان نفسی کو ہی میں اولادِ آدم کے لئے شایستہ اعتنا سمجھتا ہوں، باقی تمام تہذیبِ حاضرہ کی ساحری و شیشہ گری ہے ـــــ!

(غنیغہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف غصہ میں کڑی ہوئی بڑھتی ہے اور زور زور سے دوپٹے کی مروڑیاں بنا بنا کر ناحق اپنی انگلیاں سرخ کئے لے رہی ہے۔)

جوّاد۔ آئیے۔ آئیے۔ اپنے گھر سے بہتر کوئی سُکھ کا مقام نہیں ہے۔ وہاں آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔ آپ اپنے آپ کو خالص مشرقی خاتون کہتی ہیں۔ یہ طور طریق ایشیائی ہیں کیا؟ آئندہ ہرگز اپنے آپ سے یہ نہ کہنا کہ میں سچی اور ایماندار ہوں۔ مجھ سے سچ پوچھئے تو تمہاری آنکھوں میں تو سچ چمک رہا تھا لیکن باقی سارا وجود دغا ہے ـــــ آئیے، یہ ہے اپنے آپ کو نیچے پہونچانے کا زینہ۔

(جوادؔ اس حالت میں کھڑا ہے کہ ناصرؔ اور بچی اس موقع پر باہر سے گھوم کر واپس آجاتے ہیں۔ جوادؔ اس آمد پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ بچی جھٹ اپنی باجی سے لپٹ جاتی ہے۔ اور عفیفہؔ یہ موقع غنیمت سمجھ کر پیچھا چھڑانے کے انداز سے اُٹھتی ہے۔ ایک ہاتھ سے پیسوں کی پُڑیا مڑوڑتی ہے۔ سر کو غرور اور غصہ سے بلاوجہ بلند کرتی ہے۔ دوپٹے کو بلاوجہ چبانے لگتی ہے اور نہایت زور کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور ناصرؔ کی طرف دیکھکر مخاطب ہوتی ہے)

عفیفہ:۔ عجیب ہوٹل ......

جواد:۔ (بات کاٹ کر) یہ زینہ ہے۔

(زینے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

عفیفہ:۔ عجیب آدمی کے پاس لیکر آئے ناصرؔ صاحب۔

ناصر:۔ کیوں کیا ہوا ـــ کوئی ناگواری ہوگئی؟ ـــ مگر میں نے تو آپ کو مجبور نہیں کیا تھا۔ آپ خود ہی ان سے ملنے کے لئے اتنے عرصہ سے مجھے آمادہ کر رہی تھیں۔

عفیفہ زمانی:۔ (غصہ میں) آپ سب لوگ بدمعاش ہیں ـ مرد ہیں نہ ـــ!

(یہ کہہ کر وہ حقارت سے فرش پر تھوک دیتی ہے)

اور مچلتی ہوئی، زخم خوردہ ہرنی کی طرح، ایک تڑاقے
کے ساتھ باہر نکل جاتی ہے۔ دروازہ اس آواز کے
بعد پھر بند ہو جاتا ہے۔ کمرے کے بیچ میں پہونچکر
جواد ایک انگڑائی لیتا ہے اور مسکرا کر ناصر کی طرف
دیکھتا ہے۔)

(پردہ آہستہ گرتا ہے)

کیا تمہیں یاد ہے؟

کیا تمہیں یاد ہے کہ آج سے کوئی ۲۷ سال قبل ۱۹۰۵ء میں ہم دونوں لال میاں کے چھتہ والی اُستانی جی کے ہاں پہلے پہل قرآن شریف پڑھنے کے لئے بیٹھے تھے۔ تم ہمیں نہیں جانتی تھیں، ہم تمہیں نہیں جانتے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا ہوا کہ ہم پہلے ہی دن سے اپنا جزدان لیکر تمہارے ہی پاس آ بیٹھے تھے اور جب استانی جی ظہر کی نماز دیر سے پڑھنے کے لئے قیلولہ کرنے کے لئے لیٹ جاتی تھیں تو ہم دونوں کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ مگر تم اپنے گھر نہیں جاتی تھیں کیونکہ تم کو لینے کے لئے نوکر شام کو آتا تھا۔ تمہارے ماں باپ امیر تھے، صبح شام تمہیں لانے لے جانے کے لئے نوکر رکھ چھوڑا تھا۔ میں تمہیں لیکر اُستانی جی کی ڈیوڑھی میں ایک دو اور بچوں کے ساتھ چلا جاتا تھا اور وہاں ہم لوگ کھیلا کرتے تھے۔ عجیب عجیب قسم کے بے تکے کھیل۔ میں اِملی پر چڑھ کر کتارے توڑ لاتا تھا۔ ہمسائی ناراض ہوا کرتی تھیں مگر ہم بھلا کس کی سننے والے تھے۔ اسی زمانہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ تمہارے والد کلکتہ میں کسی بڑے عہدہ پر ہیں اور تمہاری والدہ مع ۲ دریا گنج میں

اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہیں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں اور میری والدہ چیلوں کے کوچہ میں ایک دو منزلہ مکان میں رہا کرتے تھے۔ ہماری آمدنی کا ذریعہ صرف یہی مکان تھا جو والد چھوڑ گئے تھے۔ اس کے اُوپر کا حصّہ بارہ روپے ماہوار پر دے رکھا تھا۔ نیچے کے مکان میں ہم رہا کرتے تھے۔ ماں دن رات سلائی اور کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔ جس کی بہت دُور دُور شہرت تھی۔ خاص کر دلّی کے پنجابی سوداگروں اور حکیموں کے گھرانوں میں اُن کے سلے ہوئے کپڑوں کی بڑی مانگ تھی۔ دن رات وہ سلائی کر کے میری پرورش کا سامان، اور اپنی صحت کا ستیاناس کیا کرتی تھیں۔ میری ماں یہ کام کر کے اپنا سر بلند رکھنا چاہتی تھیں۔ فخر کے ساتھ۔ تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ ویسے ہم بھی سیّد تھے اور خیرات کا لقمہ ہمارے لئے حرام تھا۔ مگر تمہیں ان چیزوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ کیونکہ میرے کپڑے گو معمولی ہوتے تھے مگر سلے ہوئے ایسے نادر ہوتے تھے کہ کوئی مجھے نادار نہیں سمجھ سکتا تھا۔ تمہیں میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو معلوم تھا وہ صرف اس قدر تھا کہ میں ایک سیدانی کا لڑکا ہوں اور میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔

میں بڑا ہونا شروع ہوا اور تم بھی بڑی ہو گئیں۔ تم سکول میں بیٹھیں اور ہم بھی کچھ پڑھ پڑھا کر اسکول کی آگے کی جماعتوں میں آ بیٹھے۔ ہمارے سکول دُور دُور نہیں تھے مگر پھر بھی ہمارے ملنے جُلنے کے

امکانات کم ہو گئے تھے۔ لیکن میں اکثر تمہارے گھر چلا جاتا تھا۔ تمہاری والدہ تمہاری دلجوئی کی خاطر میری بہت مدارات کرتی تھیں۔

میں میٹرک میں اوّل ڈویژن میں آیا اور سائنس میں سارے لڑکوں میں تیسرے درجے پر۔ اس لئے مجھے یونیورسٹی میں پڑھنے کا وظیفہ مل گیا اور میں سینٹ سٹفینز کالج میں داخل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد تم بھی میٹرک کر کے اسی کالج میں آ گئیں۔ میں کالج کے بہت ممتاز لڑکوں میں سے تھا۔ مباحثہ کی کلب۔ ڈرامیٹک کلب۔ کرکٹ۔ کالج کا میگزین۔ غرض اس مادرِ علمی کی کونسی تعلیمی و مجلسی زندگی تھی جس میں میرا اہم حصہ نہ تھا۔ اس اثنا میں تمہارے والد کا تبادلہ دہلی کا ہو گیا۔ اور اب وہ "بڑے دفتر" کے پاس اپر بیلا روڈ پر رہا کرتے تھے۔

جب ہم کالج میں پہونچ گئے تو تم نے میری طرف التفات کم کر دیا۔ بہت سے لڑکے تمہارے اِردگرد رہنے لگے۔ مگر میں خواہ مخواہ تمہاری راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے میں الگ الگ رہا اور اپنے کام میں ایسا مشغول رہا کہ تمہاری بے التفاتی، جو بطریقِ احتیاط تھی، مجھے چنداں محسوس ہی نہ ہونے پائی۔

ایک دفعہ تمہارے والد نے خطاب ملنے کی خوشی میں ایک تقریب کی اور تمہارے سب کالج کے دوست وہاں بلائے گئے۔ تم نے مجھے بھی مدعو کیا۔ میں نے جب اپنی والدہ سے اس کا ذکر کیا تو

اُن کی محنت سے سوجی ہوئی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، وہ اس حقیقت سے آگاہ تھیں کہ دن رات مجھے اگر کسی ہستی کا خیال تھا تو وہ تم تھیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگاہ تھیں کہ "پتلون کے کوچہ اور" سول لائین" میں بہت فاصلہ ہے اور اس فاصلہ کو آسانی کے ساتھ عبور نہیں کیا جاسکتا۔ مگر میری والدہ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور اپنے میلے دوپٹے سے میری نظریں بچا کر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا کہ "تم تو کہتے تھے پارٹی میں جانے کیلئے کالے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس کالا سوٹ کہاں ہے؟" مگر میں نے اُن کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کہا کہ "پچھلے سال جامع مسجد کی چوک سے جو سکینڈ ہینڈ کالا کوٹ خریدا تھا وہ ٹھیک رہے گا۔ سفید ٹھنڈی پتلون پر وہ اسقدر زیادہ بُرا نہیں معلوم ہوگا۔" مجھے اپنے کپڑوں اور تمہارے والد کی دی ہوئی پارٹی سے زیادہ تمہارا پاس خاطر ملحوظ تھا۔

جس وقت میں تمہاری کوٹھی پر پہونچا تو تم مجھے لینے کے لئے آگے بڑھیں۔ میرا دل کس قدر بڑھا۔ تمہاری آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ نیلی ساڑی میں تو تم ناہید ارضی معلوم ہو رہی تھیں۔ تمہارے چہرے پر ایک دلنواز سُرخی تھی۔ رخساروں میں سونے کی سی دمک تھی اور بال تو بس قیامت کی سجاوٹ کے ساتھ تمہارے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ تم ہال کے دروازے کے نیچے کی پٹڑی پر اتر آئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی لپکیں۔ میرے سینے

کپڑوں کی مطلق پروانہ ہوئی. شاید تم نے میری آنکھوں میں کوئی ایسی چیز دُور سے دیکھ لی تھی جو مرد ایسے مقدس لمحات کے لئے اپنی عزیز ترین ہستی کیلئے محفوظ کر رکھتا ہے!

اس کے بعد تمہاری والدہ آگے بڑھیں. یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کسی طرح برداشت نہیں کرتیں. لیکن اس وقت مجھے اس پارٹی میں پاکر انہیں بڑا دُکھ ہوگا. خیر، تمہارے کالج کے امیر دوستوں اور دوستوں کے دوستوں کے سامنے میری کوئی خاص پوچھ نہیں ہوئی. ہو بھی نہیں سکتی تھی خاص کر تمہاری والدہ نے میرے سامنے کالج کے امیر اور نازک لڑکوں کے ساتھ میزبانی و التفات کے جو مظاہرے پیش کئے اور مجھے انتقام کی حد تک جس طرح نظر انداز کیا، یہ سب چیزیں میرے لئے انتہائی باعثِ توہین تھیں مگر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میں تمہارے لئے اور تمہارے کہنے پر یہاں آیا تھا. میں تمہاری والدہ کے سامنے کچھ بھی نہ بول سکتا تھا. نئی روشنی کے امیروں کے بیچ میں ایک غریب مگر لائق طالب علم کی جو حالت ہوا کرتی ہے وہ میری بھی ہوئی. بالکل ایسے ہی جیسے کسی سرکس کے "رِنگ" (اکھاڑے) میں ایک مُنہ زور مگر بے بس گھوڑا.

پارٹی کے بعد یہ طے ہوا کہ ہم سب سینما جائیں گے. چنانچہ دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ ہم سب روانہ ہوئے. تمہیں یاد ہوگا اس وقت موٹریں زیادہ نہ تھیں اس لئے ہم لوگ کرایہ کی سواری

میں سینما تک پہونچے۔

تمہیں یاد ہے "مجنوں کا ٹیلہ" جو تمہاری کوٹھی سے چند فرلانگ پر دریائے جمن کے نزدیک ایک ایسا مقام ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک چاندنی رات کو وہاں پکنک جمی۔ ہم بہت دیر تک جمنا کے پانی کا غُل سنتے رہے اور چاند کی خنک کرنوں کو اپنی روحوں کیلئے وجہِ آسودگی بناتے رہے۔ تم چاند کی پیغام رسانیوں اور جمنا کے مترنم شور کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کرسکیں اور ہلکی ہلکی لے میں تم بھی دریا کی ہم آہنگ ہو گئیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے عرصہ تک اس ستاروں کے ترنّم کو ہم سنتے رہے۔ تم بے بس ہو کر ریت پر لیٹ گئیں اور میں ان دونوں حسین تودوں پر۔ یہ یاد نہیں کہ کس پر کم اور کس پر زیادہ۔ خیر۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں اپنے گھر کا خیال آیا اور میں تم کو کوٹھی کے دروازے تک چھوڑ نے گیا۔ بیلا روڈ کے اس حصّہ پر جہاں سے جنگی لاٹ صاحب کی کوٹھی شروع ہوتی ہے ہم دونوں رخصت ہونے کے لئے بغلگیر ہوئے اور ذرا ٹھہر گئے۔ جیسے دو ستارے چلتے چلتے تھم جائیں۔

تم دوسرے دن لکھنؤ جا رہی تھیں تمہارے والد نے اپنی بیوی کے کہنے سننے سے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں لکھنؤ کے ایک امریکن کالج میں داخل کر دیا جائے۔ یہ تدبیر محض اس لئے کی گئی تھی کہ مجھ سے ملنے جلنے کا امکان ختم ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ تم جیسی غیر معمولی

لڑکی کو جب تک یورپین طرزِ معاشرت و تعلیم نہ دلوائی جائے ان کے خاندان کا جھنڈا۔ جو ابھی بنا بھی نہ تھا! ہرگز بلند نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے لئے یہ ایک زبردست سانحہ تھا۔ تم دوسرے روز جا رہی تھیں۔ پندرہ منٹ سے زیادہ اب ہمارے پاس نہ تھے اور ایک پوری زندگی کی باتیں تم سے کرنی تھیں۔ اب اگر تم کبھی مل سکتے تھے تو صرف خط کے ذریعہ یا جب کبھی تم دلی آؤ اور مجھے بلاؤ۔

"کل تم شام کو روانہ ہو جاؤ گی۔ شاید کل تم......" میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں کیا کروں مجبور ہوں۔ مگر تم کو ہر وقت یاد رکھوں گی۔"

"میں نے اس سال ایم۔ اے کر لیا ہے اور اب میں ایک اخبار میں ملازم ہو جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ صحافت سے مجھے ایک قلبی مناسبت رہی ہے۔ شروع میں کوئی بڑی ترقی کی جگہ تو نہیں ملے گی لیکن یہ ادارہ ہے معقول لوگوں کا اگر میں نے اپنی استعداد کے جوہر وہاں دکھائے تو آئندہ بہتری کی امید ہے۔ میں یہاں کچھ نہ کچھ کرونگا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

تم نے میرے قریب تر آکر جواب دیا۔ "جمشید تم ضرور کچھ نہ کچھ کرو گے۔ کافی ترقی کرو گے۔ کیوں نہیں۔ میں لکھنؤ میں ہر وقت تمہیں یاد کروں گی۔ اگر میں نے وہاں کالج میں اردو کی انجمن قائم کی تو تم کو اس کی کسی تقریب میں ضرور بلاؤں گی۔ شاید تمہارا لکھا ہوا ڈرامہ۔ "رقصِ ناہید"

میں وہاں سیٹ کر دوں. کیا تم کوشش کر کے وہاں آؤ گے؟"

"میں ـــــ ہاں. آسکا تو ضرور آؤں گا" میں نے تم سے پکا وعدہ کیا۔

تم نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور انہیں خوب زور سے بھینچا. جسم کی طاقت سے کم، دل کے دباؤ سے زیادہ. پھر جلدی سے میرے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں کو چھڑا لیا اور تم سے مجھے چمٹ گئیں. تم نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا، میں نے اپنے لبوں کو. آج تک میں نے جن لبوں کو چھوا تک نہ تھا انہیں چوم لیا.

ایسا معلوم ہوا کہ ستارے اوپر سے اتر آئے اور انہوں نے ہم دونوں کو اپنی ردائے نور میں مستور کر لیا۔

اس وقت تمہارا فقرہ تھا: "تم میں جب تک اس رات کو نہ بھولو اس وقت تک تمہیں بھی نہیں بھول سکتی اور یہ رات زندگی میں سے کیسے بھلائی جا سکتی ہے"

کیا تمہیں یہ سب یاد ہے؟ اس رات کے بعد سے بہت سے انقلاب آ چکے ہیں. دریا گنج کا علاقہ اب بالکل بدل چکا ہے. سول لائنیں اب نئی دہلی کے مقابلہ پر ایک معمولی قصبہ معلوم ہوتا ہے. شہر میں آدمی اور موٹریں زیادہ ہو گئی ہیں، اسی لئے سڑک کے حادثات میں بھی اضافہ ہو گیا ہے. کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارکنانِ قضا و

قدر جب بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھکر اپنی فروگذاشت کا احساس کرتے ہیں تو سب سے پہلے سڑک کے حادثات میں اضافہ شروع کرتے ہیں۔ اور اب تو رکشا بھی آگئی ہے۔ پریڈ کے میدان میں، قلعہ کے نیچے گھاس لگ گئی ہے۔ رات کو اب کس قدر ٹریفک ہوتی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے والی سڑک پر کوئی ایک لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نئی بلڈنگ تیار ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے پرانے طرز کے مکانوں کا کھڑے کھڑے تمسخر اڑا رہی ہے۔ مردوں کے ناخن بڑھ گئے ہیں عورتوں نے پتلونیں پہن لی ہیں۔ کالج کی لڑکیاں اب فلم ایکٹرسوں کی طرح رہتی ہیں۔ اب ان کو لینے کیلئے موٹروں والے لڑکے اپنے اپنے سبق چھوڑ کر کالج کے پھاٹک کے سامنے گاڑیاں لئے ہوئے انتظار کرتے ہیں۔

تم نے لکھنؤ جانے کے بعد دو مہینہ تک کوئی خط نہ لکھا۔ یکایک تمہارا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ تمہارے والد کا تبادلہ ہو گیا ہے اور والدہ تمہارے پاس لکھنؤ چلی آئی ہیں۔ تمہاری والدہ کہتی ہیں کہ تم سے خط وکتابت انہیں ناپسند ہے مگر تمہاری خوشنودی کی خاطر وہ مہینہ میں ایک خط کی اجازت دے سکتی ہیں۔ میں نے پھر خود جانکر تمہیں بہت ہی کم خط لکھے۔ ماؤں کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے۔

میں صحافت میں نام پیدا کرتا رہا، ہر وقت اپنا کاروبار جاری کرنے کی فکر رہی۔ میں ہر وقت تمہارے خیال میں مگن رہتا تھا اس سے

کام میں دل لگا رہتا ہے۔ تمہاری خالہ زاد بہن کشور نے بچپن کی ناسمجھی یا ازراہِ خصومت میرا تذکرہ تمہارے والد سے کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہدیا کہ "روشن باجی کو جمشید کی طرف کچھ خیال معلوم ہوتا ہے؟" نیز یہ کہ تم مجھے خط لکھنے کے لئے اس قدر بیتاب رہتی ہو کہ اکثر کھانے کو بھی نظر انداز کر دیتی ہو۔ ڈاک لانے کیلئے تم نوکر پر بھروسہ نہیں کرتیں اور خود بڑے ڈاکخانہ جاتی ہو۔

تم نے لکھنؤ کے اپنے نئے کالج میں اُردو کا چرچا شروع کیا۔ اور وہاں ایک اُردو کھیل اسٹیج کرنے کی طرح ڈالی۔ یہ ڈرامہ میرا لکھا ہوا تھا جو تمہیں دو وجہوں سے پسند تھا۔ ایک اپنی وجہ سے اور ایک میری وجہ سے۔ میری وجہ سے یوں کہ میں نے لکھا تھا۔ اپنی وجہ سے یوں کہ تمہارے لئے لکھا گیا تھا۔ تم نے اپنی والدہ کو ناراض کرنے کے لئے مجھے اس ڈرامہ کی پہلی شب دکھانے کے لئے لکھنؤ مدعو کیا اور اپنے گھر پر ایک ڈنر بھی تجویز کیا۔

ہم نے خط کے ذریعہ یہ طے کیا تھا کہ میں جمعہ کی شام کو لکھنؤ کے لئے روانہ ہوں گا اور دوسرے دن ہفتہ کو لکھنؤ پہنچونگا۔ کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ پہلے ڈنر میں شریک ہونگا اس کے بعد کالج جائینگے۔ میں دوسرے ہی دن واپس ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ پیر والے روز مجھے دہلی میں کچھ کام تھا۔

میں لکھنؤ پہنچا۔ ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا۔ بڑھیا ہوٹلوں میں

مردِ معقول یعنی شریف مفلس کا کام نہیں ہوتا۔

میں تمہارے گھر پہونچا تو وہاں بہت سے بڑے بڑے آدمی، اچھے اچھے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ یہاں کی یونیورسٹی بہت "ایڈوانسڈ" ہے۔ مستقبل میں ہونے والے میاں بیوی اور اُنکے ساتھ ایک ایک ماں باپ کو یہاں دیکھا۔ جیسے ایکسپریس ٹرین میں بعض دفعہ مال کے ڈبے لگا دئے جاتے ہیں۔ میں ایسے امیر مجمع میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ حیران و ششدر کبھی اس کا منہ دیکھتا تھا کبھی اس کا، جیسے شیش محل میں کتا آکر پھنس جائے!

میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ تم میرے قریب آکر بیٹھ تو گئیں مگر مجھ سے زیادہ بات نہ کی۔ میں نے سمجھ لیا کہ میری پتلون بہت موٹے زین کی ہے اور اس پر جاپانی قمیص ہے۔ دلّی کے کوڑیا پُل کے بنے ہوئے بھدّے جوتے ڈنر کے موقع کیلئے تو انتہائی بے زیب چیز تھے۔ یہ سب چیزیں صاف ستھری تھیں تو کیا، تھیں تو سستی اور غریب چہرہ!

خیر! بہت کوفت رہی۔ بڑی مشکل سے یہ وقت کاٹا۔ اس کے بعد لوگ رخصت ہونے شروع ہوئے۔ امیر لڑکوں نے سفید سفید چمڑے کے دستانے نکال کر پہنے اور موٹر بائیکلوں پر کسی کسی کو بٹھا کر چل پڑے۔ میری جاپانی قمیص اور پیدل چلنے کی نیت نمایاں طور پر تمہاری پارٹی کیلئے وجہِ تفنن بنی ہوئی تھی۔

میں نے تم سے کہا۔ روشن۔ دیکھو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سواری کا انتظام کرتا۔"

"جمشید، اس میں فکر کی کیا بات ہے میرا تو خود خیال ہے کہ پیدل چلوں۔ کالج دور ہی کتنا ہے۔ ہے نہ؟"

میں نے منہ سے کہا "ہاں"۔ دل میں سوچا کیسی غلطی کی۔ اس وقت اگر کرایہ کی موٹر لے آتے تو خاصا اچھا رہتا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ لوگ تھوڑے تھوڑے فاصلوں کے لئے بھی کار کے استعمال کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نمائشی دنیا کو پیدل چلنا اتنا دوبھر نہیں معلوم ہوتا جسقدر موٹر نشینی کی ترغیب کو روکنا!

تمہارے کالج کی بلڈنگ چند فرلانگ پر تھی۔ ہم دونوں چاندنی رات میں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔

ڈرامہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے لوگوں سے میرا تعارف ہوا۔ کچھ لوگوں نے میرا نام سنا تھا کچھ نے نہیں سنا تھا۔ کچھ نے سنا تھا یاد نہیں رہا تھا۔ بعض کی سماعت اور بصارت و حافظہ سب کے سب امیری کے دھماکہ کے باعث عرصہ ہوا ضائع ہو چکے تھے اس لئے وہ کچھ خاطر میں نہیں لائے۔ بلکہ تم پر دل ہی دل میں نفریں کرتے تھے کہ کس قلی کے ساتھ آ جا رہی ہیں۔ کالج میں جن لڑکیوں نے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا اُن کے نبھانے والے لڑکوں نے پہلے ہی سے پھولوں کے دستے تیار کر رکھے تھے۔ میں کچھ بھی لیکر نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں نے

تمہیں چپکے سے کالج کے لان کی طرف بلایا۔ تم دیوار پر لگی ہوئی عشق پیچاں کی بیل سے کمر لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے کہا "روشن، مجھے معاف کرنا۔ مجھے بالکل دھیان نہیں رہا۔ میرا مطلب ہے ایسے موقع پر لوگ پھولوں کے دستے اظہار تحسین کیلئے دیا کرتے ہیں۔"

تم نے میری طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں مگر تم پی گئیں۔ دلاسہ دیتے ہوئے تم نے کہا "جم۔ پھولوں سے کیا ہوتا ہے۔ میں......"

تم نے اپنا سر میرے شانوں پر رکھ دیا۔ تم عشق پیچاں کی طرح کیسی لچکدار اور نرم تھیں۔ میں تمہارے جسم سے پیوست کھڑا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ انجام کا آغاز ہے۔

بڑی مشکل سے تقریب ختم ہوئی۔ اس کے بعد میں بہت دیر تک تمہارے دوستوں سے ان ہی کی زبان میں بات کرتا رہا لیکن کچھ زیادہ نہیں۔

جب میں دہلی واپس جانے لگا تو تم اسٹیشن پر مجھے "سی آف" کرنے کے لئے آئیں۔ اس موقع پر میں نے تم سے کہا "روشن تم نے مجھے بلا کر اپنی پارٹی کا ستیاناس کیا۔ مجھے بھی بیوقوف بنوایا۔ میں ان بڑے آدمیوں سے ملنے کا اہل نہیں ہوں؟"

"تم مجھے تو جانتے ہو جمشید!" تمہارا جواب تھا۔

ایک دو منٹ بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے تمہارے شانوں پر ہاتھ

رکھ کر کہا: "اگر آئندہ میری یاد تمہیں آئے تو یہ اقرار یاد رکھنا کہ مجھے تم سے دلی عشق ہے۔"

تمہاری آنکھیں بند ہو گئیں اور تم نے میری طرف سر جھکا کر کہا۔ جمشید تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا یہ لفظ ضروری ہیں!؟

میں نے دہلی پہونچ کر تمہیں پارٹی میں مدعو کرنے کی عنایت پر ایک شکریہ کا خط لکھا۔ اس کا جواب نہیں ملا۔ کئی ہفتے گذر گئے۔ اس کے بعد میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اب میری زندگی میں سوائے تمہاری یاد کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ فلم کا موضوع اور میری بے لاگ تنقیدیں۔ رسالہ چل پڑا۔ کچھ اور کام بھی شروع کیا۔ ماں نے سوئی اور انگشتانہ رکھ دیا اور ہم آسائش کے ساتھ بسر کرنے لگے۔

کیا تمہیں یہ سب یاد ہے؟ کیا تمہیں یاد ہے کتنے دن بیت گئے۔ بیس سال سے بھی اوپر شاید۔ کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے جسے ہم ہر سال مناتے ہیں۔

ہاں۔ ایک روز تم مجھے دہلی میں اچانک مل گئیں۔ سودا خریدتی ہوئی۔ تمہاری آنکھوں میں وہی چمک پیدا ہو گئی۔ میں نے تمہیں یاد دلایا کہ لکھنؤ اسٹیشن پر رخصت ہوتے وقت میں نے کیا اقرار

کیسا تھا۔

میں اس کو پوری طرح یاد دلانے بھی نہ پایا تھا کہ تم نے بیچ میں بول کر کہا: "مجھے سب یاد ہے۔ میں کیا محبت نہیں کرتی ہوں!"
اس کے بعد ہم نے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ اکثر بڑے بڑے فیصلے چند لمحوں میں ہی ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم نے بھی سرراہے ایک فیصلہ کیا۔ میں چاندنی چوک کے اس حصہ کو اب بھی زندگی کا موڑ کہتا ہوں جہاں پٹری پر کھڑے ہو کر ہم نے ایک فیصلہ کیا تھا۔
اس کے بعد ہم وہ ہو گئے جو اب ہیں۔ باقی دنیا میں جو تھا اُسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ اگر آدمی دنیا کے غیر اہم اجزا کو نظر انداز نہ کرے تو زندگی جامد ہو جائے۔

پیاری روشن، تم آجکل رفیعہ کے بارے میں بہت پریشان ہو۔ کبھی کچھ سوچتی ہو کبھی کچھ۔ دنیاوی جاہ کو نظر انداز کرنا تم نے مجھے سکھایا تھا، اس سبق کو، جو شاید امتدادِ زمانہ نے تمہارے حافظہ سے محو کر دیا ہے، یاد دلانا میرے حصہ میں رہ گیا تھا۔ تم آجکل رفیعہ کے بارے میں جمع خاطر محسوس نہیں کر رہی ہو بالکل اسی طرح جیسے کبھی تمہاری والدہ تمہارے بارے میں پریشان رہا کرتی تھیں۔ ہماری رفیعہ کی عمر ۲۱ سال سے اوپر ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اُسے کلیم سے محبت ہے۔ میری درخواست ہے کہ تم کلیم کو اپنی زندگی میں کچھ کرنے کا ایک موقع دو۔ تم رفیعہ کی راہ میں مت آؤ۔ تم کلیم کے بارے میں اس

وقت فیصلہ کرنا جب خود اپنے رومان کو دریچے میں نے جیسا تیسا لکھنے کی کوشش کی ہے، ایک بار اپنے حافظہ میں تصویر کی طرح لا کر نہ دیکھ لو۔

یہ میرا، شادی کی اس سالگرہ کے موقع پر، تحفہ ہے۔ میں اسے تمہارے سرہانے، اس کمرے میں جہاں تم سو رہی ہو، چھوڑے جاتا ہوں۔ اسے پڑھنا، سمجھنا اور پھر فیصلہ کرنا۔

اور ہاں۔ خوب یاد آیا۔ یکم جون کو ہم رضیہ کی بھی تو سالگرہ کر رہے ہیں، اس موقع پر ایک پارٹی رہے۔ اس میں کلیم کو بھی کیوں نہ بلائیں؟ وہ ضرور آئے گا۔ ایک بڑے ایڈیٹر۔ اس کی ممبر اسمبلی بیوی اور دیگر بڑے بڑے مہمانوں کے درمیان کلیم واقعی بہت گھبرائے گا۔ ممکن ہے وہ ایک جالی دار جاپانی بنیان اور سفید پتلون میں ہی ہمارے ہاں کھانے پر آئے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ کیا کیا بہکے گا۔ وہ کیا جانے بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ کس طرح بات کی جاتی ہے۔

لیکن بہت دن ہوئے کہ تم نے بھی تو اسی طرح اپنے ایک پرانے دوست کو، جو کالج میں اور اس سے پہلے تمہارے ساتھ پڑھ چکا تھا، اپنے ہاں ڈنر پر بلایا تھا۔

— کیا تمہیں یاد ہے؟۔

ہم تینوں

جب لطیف گلی میں نکلتا چھوٹے چھوٹے بچے اور بڑے بڑے لڑکے سب ہی باہر نکل کر کھڑے ہو جاتے اور اس کی لنگڑاتی ٹانگ کا مذاق اُڑاتے: "لنگڑ دین بجائے بین" کہتے اور پتھر مار مار کر بھاگ جاتے۔ وہ ایک خاص طریقے سے اپنی دائیں ٹانگ آگے ڈال کر بائیں ٹانگ کو اس کے عقب میں حرکت دیتا تھا اور بچے اس انداز خرام پر لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ اپاہج سب قسم کی ذلتیں برداشت کر سکتے ہیں مگر کوئی اُن کی ہنسی اُڑائے تو یہ اُن سے ضبط نہیں ہو سکتا۔ یہی حال لطیف کا تھا۔ وہ بہت کم اپنے گھر سے نکلتا تھا۔ اس کی ساری عمر دُنیا سے نفرت کرتے ہوئے اور دُنیا والوں سے جلتے ہوئے ہو گئی تھی۔ اور اس ہی وجہ سے اس کا چہرہ بھی مسخ ہو گیا تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر گھن کھانے لگتے تھے اور بعض بعض بچے تو ڈر بھی جاتے تھے مگر جو بچے ڈرنا نہیں جانتے وہ صرف ہنسنا ہی جانتے ہیں اور ایسے بچے ہنسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چنانچہ ادھر لطیف نے گھر سے باہر قدم نکالا اور محلہ کے لڑکوں نے اُسے ستانا شروع کیا۔

اس نے جلد سازی کا کام شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اب وہ زیادہ مشقّت کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اور اس کا دوست شریف دونوں نگینہ کے چوڑی کے کارخانہ میں کام کرتے تھے مگر ایک دن بھٹی پھٹنے سے کئی آدمی زخمی ہوئے، ان میں یہ دونوں یار بھی تھے۔ شریف کے بُری طرح چوٹیں آئی تھیں۔ لطیف بھی اس ہی جگہ کام کر رہا تھا اور مرتے مرتے بچا تھا۔ شریف اپنی بیوی نصیرہ کو لیکر دہلی آ گیا تھا اور لطیف اور وہ تینوں مل کر ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ نصیرہ چھوٹی سی گڑیا تھی۔ رنگ اور ناک نقشہ نگینہ کی نازک اور رنگین چوڑیوں کی مانند سہانا تھا۔ شریف نے برلا ملز میں کام شروع کر دیا تھا اور لطیف چونکہ معذور تھا اس لئے گھر پر کچھ محنت مزدوری کرتا تھا اور جلد سازی کا کام تو اکثر کرتا تھا۔

شریف جس وقت "مِل" کی دیو پیکر مشینوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر اپنا کام شروع کرتا تو کبھی کبھی اُسے اپنی بدنصیبی پر رونا آنے لگتا تھا۔ نگینہ والے حادثہ نے شریف کی مردانگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ اس کے مردانہ اعضا بہت عرصہ تک متورم رہے تھے۔ پھر ٹھیک ہو گئے مگر قوت مردمی دائمی طور پر اس حادثہ کی نذر ہو گئی تھی۔ اِسے اپنی قوت مردمی کے ضائع ہونے کا اس قدر ملال نہ تھا جس قدر اس خیال سے اُسے تاسّف ہوتا تھا کہ نصیرہ اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ وہ ایک دفعہ بھی تو ماں نہ بنی تھی۔ اس کی آرزوؤں کا

چمن ہمیشہ کے لئے اُجڑ گیا تھا۔ وہ کسی بچّے کو اپنا بچّہ کہہ کر اس دُنیا میں نہ کھلا سکے گی اور شفقتِ مادری کا جذبہ اس کے سینے میں کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔ شفقتِ مادری کا رس اس کے پستانوں سے کبھی سرچشمۂ مہرو حیات بن کر اُبلے گا ہی نہیں۔ شریف کو معلوم تھا کہ چپکے ہی چپکے نصیرہ میں جنسی بھوک تیز تر ہو رہی تھی اور ماں بننے کی ہوس ہی تھی جس نے اُسے گلی کے بچّوں سے اس قدر مانوس کر دیا تھا۔ وہ طرح طرح سے انہیں بہلا کر باورچی خانہ میں لے جاتی تھی، اُن سے کھیلتی تھی، اُنکو چومتی تھی، انہیں بھینچتی تھی اور میٹھی میٹھی چیزیں کھلاتی تھی۔

شریف اور لطیف جگری دوست تھے اور بچپن سے دونوں میں وہ ربط رہا تھا کہ رشتہ داری بھی کیا چیز ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دونوں مصیبت کے مارے رزق کی تلاش میں دلّی آئے اور ننگے کرایہ کے مکان میں ایک ساتھ رہنے لگے تو شریف نے نصیرہ سے پردہ کرانا چھوڑ دیا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ لطیف تو اپاہج تھا اور دن رات مکان ہی میں ایک دالان میں بیٹھا جلدیں بنائے جاتا تھا۔ نصیرہ بھلا کہاں تک پردہ کرتی۔

نصیرہ کو دن بھر کام رہتا تھا۔ اللہ کے فضل سے اس کے گھر میں دو مرد تھے ایک ہی مرد کے لئے عورت اگر چاہے تو کتنی دردسری کر سکتی ہے اور سارے دن چرخے کی مال کی طرح گھوم سکتی ہے اور جب خدا رکھے گھر میں دو مردوں کا کھانا پکانا اور غریبی موافق

چیز بست کا ٹھیک ٹھکانے رکھنا بھی شامل ہو تو نصیرہ جیسی عورت کیلئے دن بھر کام ہی کام سمجھنا چاہیئے۔

کبھی کبھی نصیرہ سوچنے لگتی نگینہ والے مکان کا بیری کا درخت اب کتنا بڑا اور اونچا ہو گیا ہو گا۔ یہاں دلّی کی زمین کمبخت سخت اور شوریلی بہت ہے بھلا یہاں کوئی کیاری کس طرح لگائے کوئی پودہ کیسے بوئے اور پھر نگینہ والا مکان یہاں پچاس روپے کرایہ پر بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بارہ روپے کے مکان میں گذر کرتے ہوئے پودوں اور پھلوں کا خیال اسے خود بخود جھنیا دیتا تھا۔ نصیرہ کو چنبیلی کے پھولوں کا بہت شوق تھا۔ ایک گملے میں کچھ شاخیں پیوست کر رکھی تھیں مگر ابھی تک تو بار آور نہیں ہوئی تھیں۔

جب دن بھر کتابوں کے پشتے ٹھونکتے ٹھونکتے اور شیرازے سیتے سیتے لطیف کی موٹی انگلیاں اور مضبوط بازو بالکل تھک جاتے یا بیچ میں ظہر کی نماز کے وقت وہ ذرا سستانے کی سوچتا تو لنگڑاتا لنگڑاتا باورچی خانہ کا رخ کرتا۔ چلم بھرنے کے بہانے سے نصیرہ کے پاس آ بیٹھتا۔ نصیرہ کو اب ان چیزوں کی عادت ہو گئی تھی۔ کہاں تک وہ بھاگتی۔ کب تک چھپی چھپی ادھر ادھر دیکھتی پھرتی۔ اب لطیف اگر آ کر اس کے پاس بیٹھ جاتا تو وہ چپ بیٹھی اپنی دال بینتی رہتی تھی یا شریف کے کرتوں میں کاج بناتی رہتی۔ جب گرہستن کے پاس کوئی کام نہ رہے تو کاج بنانے لگتی ہے!

شام کو جب شریف مِل سے واپس آتا تو لطیف بھی ٹھیک ٹھاک ہو کر انگنائی میں آ بیٹھتا۔ دونوں مل کر کھانا کھاتے اور اس کے بعد حقّہ پہلو میں اور شطرنج کی بساط بیچ میں رکھکر اس طرح غرق ہو جاتے کہ دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ شطرنج ایسا کھیل ہے کہ اگر پاس کوئی عورت بیٹھی ہوئی کپڑوں کی مرمّت کرتی ہو یا بلّی سے خواہ مخواہ کھیل رہی ہو تو شاطروں کو ہرگز پتہ نہیں چل سکتا کہ عین پڑوس میں یہ کیسا حسین ڈرامہ ہو رہا ہے۔

یہ لوگ کسی سے ملتے جُلتے نہ تھے۔ اوّل تو مزدور پیشہ لوگ دوسرے کشن گنج اور پل بنگش کی آبادی میں کثرت پنجابی سوداگروں کی یا بابوؤں کی۔ ان کو مُنہ کون لگاتا۔ اور پردیسی گنوار سمجھ کر ان سے دلّی والے بھلا بات کرنی کب پسند کرتے۔ ان کی کسی سے ملّت نہ تھی۔ شام ہوئی اور تینوں سمٹ کر ایک جگہ اپنی دنیا بنا کر بیٹھ گئے۔ صبح ہوئی اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ لطیف کو اپنا ماضی بس اتنا یاد تھا کہ اس کا باپ کوئٹہ میں کسی ملٹنی صاحب کے ہاں موٹر ڈرائیور تھا۔ بد چلنی میں پکڑا گیا۔ ماں سے بُری طرح سلوک کرتا تھا۔ اور اس کی ماں بڑی نیکبخت تھی۔ بہت پاپڑ بیل کر اُسے پالا تھا۔ اسکے مرنے کے بعد وہ اور شریف ایسے گہرے یار بنے تھے کہ ان کی دوستی اور سچی پُر خلوص محبت کو لوگ مثال کے طور پر ذہن میں رکھا کرتے تھے مگر زبان سے اُن کی تعریف نہ کرتے تھے مبادا کہ اُن کی اپنی دوستیوں

کو لوگ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگیں ــــ!

اب نصیرہ بدل رہی تھی۔ اس پر طرح طرح کی کیفیتیں طاری ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی تو وہ بچوں اور پاگلوں کی طرح بلا وجہ خوش اور آپے سے باہر ہو جاتی تھی اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایسی خاموش، پُر الم اور غم رسیدہ سی بن جاتی تھی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہی وہ نصیرہ ہے۔ سوچنے بیٹھ جاتی تو گھنٹوں چھپکلی کی طرح ایک کونے میں جمی ہوئی سوچے ہی جاتی۔ کبھی اس کی حرکتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی کی پکار سننے کے لئے تن کر بیٹھی ہے۔ یا کوئی اُسے اپنی طرف بلانے والا ہے جو تیار اور منتظر کھڑی ہے۔

برسات کے دن تھے۔ دلی کی برساتیں اپنی جگہ خوب ہوتی ہیں مگر نصیرہ کو تو نگینہ کی برسات سے شیر خوارگی کی حالت سے اُنسیت تھی اس لئے وہ یہاں نگینہ والی بات نہ پاتی تھی۔ وہ جب اپنے نانا کے ہاں گاؤں میں جا کر پوربنوں کے ساتھ جھولا ڈال کر بھدّے پن کی حد تک سیدھے سیدھے گیت گاتی تھی تو اور ہی لطف آتا تھا۔ یہاں لڑکیاں اب پُرانی طرز کے برساتی گیت تو بھول ہی چکی تھیں سینما کے گیت گاتی تھیں یا پنجابی عورتوں کی دیکھا دیکھی کچھ لڑکیاں پنجابی گانے بلا سوچے سمجھے گاتی تھیں۔ یہ سب کچھ نصیرہ کی نہ تو سمجھ میں آتا تھا نہ وہ انہیں پسند کرتی تھی ــــ برسات آئی۔ کئی برساتیں آ چکی تھیں مگر ایک برسات اُسے خاص طور پر چبھ رہی تھی۔

نصیرہ کبھی کبھی اپنے دل میں سوچنے لگتی تھی کہ اگر کچھ پس انداز ہو جائے تو پھر نگینہ واپس چل کر رہنا چاہیئے۔ کوئی دکان وکان کریں گے۔ آج اسے بڑے زور سے یہ چیز ستا رہی تھی کہ کاش جلدی سے اس شہر سے جانا ہو۔ اس شہر کی رت تو اسے بھاتی نہ تھی اور برسات اپنی پوری کوششوں کے ساتھ اسے گھر کی یاد دلا رہی تھی۔ گھر کی یاد کے ساتھ اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب برسات آتی تھی اور شریف اور وہ مل کر ہنسی خوشی اپنے تنہا گھر میں برسات مناتے تھے۔ مگر اب شریف کو قدرت کی ستم ظریفی یا حالات کی سفاکی نے ایک ایسے سانپ کی کی مانند بنا دیا تھا جو دیکھنے میں تو سانپ تھا مگر اس کی کچلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ سانپ کی جوشش و تندی سے محروم ہو گیا تھا۔ برسات کی مست ہوا نے نصیرہ کے رگ و پے میں ایک گرمی سی دوڑا دی۔ زندگی کیسی اجیرن ہے۔ خاموش، بے مزا پھیکی زندگی۔ صرف روٹیاں گھڑنا اور کپڑے سینا۔ برتن بلا وجہ ٹھیک کرتے رہنا بھی بھلا کوئی زندگی ہے — شریف کے ساتھ اس کی زندگی اب بھی گذر رہی تھی، مگر بے کیفی کے ساتھ۔ وہ گھوڑا کس کام کا جو منہ ڈالے صرف گھاس کھاتا رہے اور کبھی چھچکے نہیں۔ کبھی پلٹ کر منہ نہ مارے۔ کبھی منہ زوری نہ کرے! نصیرہ کو غریب، ناکارہ اور مرنجاں مرنج شریف اس کے لئے اپنے مقدور بھر سب ہی کچھ لا دیا کرتا تھا۔ کپڑا، زیور، تیل، مسی، عطر، پان، رت کا پھل میوہ، مٹھائی مگر یہ سب چیزیں کیا واقعی اسے

محبّت سے ہم کنار کر دیتی تھیں. شریف اُسے اب بھی چاہتا تھا، اسے ہر طرح سے خوش رکھتا تھا مگر یہ سب نقل تھی اور اس وجہ سے نقل اور بھی معلوم ہوتی تھی کہ نصیرہ اس ہی شریف کی اصل محبت بھی تو دیکھ چکی تھی ——— یہ سب باتیں وہ آج چھت پر کھڑی کھڑی سوچ رہی تھی۔ بوندیاں آتے ہی اس نے پلنگ جلدی جلدی نیچے اُتارے۔ برسات کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ اس کے جذبات کے پرچم بہت دیر تک دماغ کے افق پر لہراتے رہے۔ اس کے دونوں ہونٹ ایک بے اختیار جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور وہ برسات کی ہوا کا زیادہ لُطف اُٹھانے سے ایکدم تکلیف سی محسوس کرنے لگی۔

لطیف کو چونکہ دن بھر گھر میں ہی کام کرنا پڑتا تھا اس لئے نصیرہ کی طرف دیکھنے کا اُسے بہت موقع ملتا تھا۔ نصیرہ بھی اس واقعہ سے آگاہ تھی کہ خواہ وہ باورچی خانہ سے نکل کر گھڑونچی تک پانی بھرنے کے لئے آئی ہو یا لوٹا لیکر پاخانہ میں گھسی ہو۔ یا ترکاری کاٹنے کی چھری ڈھونڈتے ڈھونڈتے دالان تک گھس آئی ہو لطیف کی نظریں اُس کا پیچھا کرتی رہتی تھیں!

نصیرہ پر جو کیفیتیں آئے دن گذر رہی تھیں اور نت نئی باتیں اُسکی حرکتوں اور چہرے کے تغیرات سے ظاہر ہو رہی تھیں لطیف ان سب کو اپنے ٹھیئے پر بیٹھا بیٹھا غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نصیرہ

پر دراصل کیا آفت آئی ہوئی ہے، اُسے دُکھ کس چیز کا ہے۔ لطیف کی مٹی میں بے چینی اور بغاوت کے کچھ ذرّے خمیر ہو گئے تھے اور ابتدائے ایام سے اس میں یہ سیمابی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وہ نصیرہ کا دکھ نہ دیکھ سکا اور اپنے مخصوص اکھڑ پن کے ساتھ اس کی رُوح نے ایک روز بغاوت کی اور قدرت سے اُس نے اپنے دل میں سوال کیا کہ نصیرہ بچاری کیا کرے۔ وہ ٹانٹیل چپکا تا جاتا تھا اور لئی سے بھری ہوئی انگلیوں سے ناک کھجاتا جاتا تھا کوئی اہم سوال اس کے دماغ میں پیدا ہو رہا تھا اور اپنے طریقے پر وہ اس کا جواب بھی دے رہا تھا ایک طرح سے وہ قدرت کی ستم ظریفی اور نصیرہ کے دُکھ کو دیکھ دیکھ کر برداشت کرتا رہا تھا مگر اب اس کی طبیعت آتشگیر ہو چکی تھی اور دماغ کسی فیصلہ پر آکر جم گیا تھا۔ شاید لطیف نے کچھ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

ایک دن نصیرہ نہ جانے کس سوچ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی، چہرہ اُداس تھا اور چنبیلی کے گجرے جو شریف رات کو لایا تھا اس کے پاس یونہی پڑے ہوئے تھے۔ وہ ان گجروں کی پتیاں آہستہ آہستہ بے خیالی میں توڑ توڑ کر دانتوں سے کاٹ کاٹ کر، نیچے پھینک رہی تھی اور اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ اتنی دیر سے کیا کر رہی ہے۔

نصیرہ کو اس حالت میں دیکھ کر لطیف سے نہ رہا گیا۔ وہ اپنی جگہ سے بہت آہستگی کے ساتھ اُٹھا اور پیچھے سے نصیرہ کی کمر کے

پیچھے آکر بیٹھ گیا۔
"کیا سوچا کرتی ہو نصیرہ بھابی" لطیف نے ایسے ہولے سے نصیرہ کے بازو دبکڑ کر کہا جیسے اس نے پکڑے ہی نہیں۔
نصیرہ چونک پڑی۔ دن کا کام کاج کرنے سے پہلے ہی وہ قمیص آستینوں تک چڑھا لیا کرتی تھی تاکہ کپڑے میلے نہ ہوں اس نے اپنے گرم بازو کے نرم گوشت میں لطیف کی کھردری انگلیوں کا لمس ذرا سی دیر کے لئے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے جلتا ہوا پتنگا رکھ دیا ہو۔ وہ ایک دفعہ دیکھنے لگی کہ واقعی لطیف نے کوئی پتنگا تو شرارت سے اس کی آستین میں نہیں ڈال دیا۔ دونوں کے جسم کا یہ اتصال ایک شعلہ جوالہ میں تبدیل ہو گیا۔
"یہ کیا بیہودگی ہے" نصیرہ کہہ کر ایک دم سے اچھل کر پلنگ سے اتر پڑی۔ اس کا چہرہ اور گلا دوران خون کے باعث سرخ ہو گئے!
"واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ایسا مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا اور جو ابھی کوئی دیکھ لیتا"
نصیرہ خود شرمانے سے زیادہ لطیف پر بگڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ لنگڑے لطیف نے واپس آکر جلدی جلدی فرمے موڑنے شروع کر دئے۔ اس کے ہاتھ کی صفائی اور چہرے کی بے پروائی سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ واقعہ بھی اس نے کاغذوں کی طرح تہہ کر کے رکھ دیا ہے۔

سارا دن ویسے ہی گذر گیا جیسے اور دن گذر جاتے تھے۔ نصیرہ نے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اُسے لطیف کی انگلیوں نے رگوں کے تار پر کوئی پیغام بھیجا ہے۔

اس بات کو کئی دن گذر گئے۔ شریف بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ نصیرہ چھپے چھپکے سسکیاں لیتی ہے۔ دانت سے ہونٹ کاٹتی ہے اور چُپ چُپ رہتی ہے۔ اپنے خاص انداز رحم و بے بسی میں شریف سوچا کرتا تھا کہ کیوں نہ نصیرہ کو طلاق دیدوں۔ دُنیا کو اِس حالت کا علم نہیں تو کیا ہے۔ خدا تو بہتر جانتا ہے۔ اس حالت میں ہر مرد پر فرض ہے کہ طلاق دیدے اور نصیرہ کی جوانی برباد نہ کرے۔ وہ پسماندہ ہندوستانی عورت تھی اُسے کیا پتہ تھا کہ عورتوں کے کیا حقوق ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔

ایک دن جب لطیف اور نصیرہ حسب معمول اکیلے تھے نصیرہ پاس ہی بیٹھ کر لطیف کی بنائی ہوئی کتابوں کو بلا وجہ دیکھنے لگی۔ اس نے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔ یونہی ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ اُسے ایک تصویر دکھائی دی جس میں ایک مرد ایک عورت کو پیار کر رہا تھا۔ یہ تصویر کسی فلمی منظر سے لی گئی تھی۔ نصیرہ کی آنکھیں کتاب بند ہونے سے پہلے ہی بند ہو گئیں اور اس نے اُسے ایک طرف رکھکر پوچھا۔ "ہماری بھی کیا زندگی ہے؟"

لطیف اپنے کام میں لگا رہا۔

"ہونہہ!"

"میں نے کہا سُن رہے ہو یا اپنی کھٹ کھٹ ہی کئے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں سُن رہا ہوں۔ بولو کیا کہہ رہی تھیں میں نے سُنا نہیں۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہماری بھی بھلا کیا زندگی ہے؟"

لطیف نے حقّہ کا ایک کش ذرا زور سے لیکر دھوئیں کے بادل کا ایک پردہ بنایا تاکہ نصیرہ کے سوال کا اصل مطلب چہرہ کی ڈکشنری کی مدد سے سمجھ سکے۔

"ہاں زندگی بس اجیرن ہے۔ کس کام کی یہ زندگی! تھُو ہے!"

غرض لطیف نے بلا تامل کئی بار زندگی کی ہجو کر ڈالی۔

"زندگی کہتے کِسے ہیں پہلے ہی بتاؤ۔" لطیف نے کچھ سوچ کر ایک بات بنائی۔

"میں کیا جانوں۔" نصیرہ نے بالکل سچ سچ کہدیا۔

"اچھا۔ تم نہیں جانتیں۔ اتنی بڑی ویسے ہی ہو گئیں۔ ارے بھئی زندگی نام ہے زندگی کا ——— یعنی یوں سمجھو کہ زندگی۔ ہے یہ کہ آدمی کھائے پئے مزے کرے ——— اب میں تم سے کیا کہوں۔ زندگی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو زندہ بنا کر دکھائے۔ آدمی میں جیسے بھوک، پیاس، غصّہ وغیرہ خدا تعالیٰ نے دیا ہے، ایسے ہی اور باتوں کی تمیز بھی اُسے دی ہے۔ اگر آدمی میں یہ بات نہ ہو تو وہ

کس کام کا ہے۔ آدمی جب تک اپنا جیسا کوئی دوسرا آدمی نہ بنا سکے. میرا مطلب یہ ہے کہ نسل سے انسان کا نام چلتا ہے. اگر دیکھو تو نسل کیا ہے. ہم خود ہیں. بچّوں کے بغیر ہم اپنی جگہ ختم ہیں. بچّے ہوں تو ہماری لین ڈوری آگے تک چلے. ہم اس قطار کو دیکھکر خوش ہوں کہ ہم نے اپنے جیسے کئی بنا دئیے اور یہ تاقیامت سلسلہ چلتا رہیگا۔"

غرض لطیف اپنی جگہ جس قدر بھی جنسیات کو سمجھ سکا تھا وہ نصیرہ کے دماغ میں اسوقت گھسانے کی کوشش کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ نہ جانے ایسا موضوعِ گفتگو کب چھڑے. آج کیوں نہ صفائی سے سب باتیں کر لو۔

نصیرہ خاموش بیٹھی تھی. کبھی کبھی انگلیوں کو دانتوں سے کاٹنے لگتی تھی۔

لطیف نے پھر پکار کر کہا: "نصیرہ!"

نصیرہ چپ بیٹھی تھی جیسے اسے لقوہ ہو گیا ہے.

"نصیرہ!" اُس نے پھر کہا. اور یہ کہتے کہتے وہ لنگڑا کر اُٹھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں نصیرہ کی آنکھوں سے اُلجھا دیں اور اُن میں فطرت کو شکار کرنے والے باغی شعلے دمک اُٹھے. اُن کی حرارت میں ایک پوشیدہ قصد جنم لے رہا تھا۔

"تم ... نصیرہ تم کب تک مجھ سے الگ رہو گی! آخر کب تک ہم دونوں الگ رہ سکتے ہیں. کوئی حد بھی ہے میرے اور تمہارے ضبط

کی!" اس کی آواز مدھم اور رقّت آمیز سی ہو گئی۔ اس کے دل کا جام جذبۂ اسفل سے لبریز ہو کر چھلکا تھا مگر اب اس جام کی تہ میں نصیرہ کے لئے ہمدردی کے جذبات کے علاوہ اور کوئی ذرّہ باقی نہ رہا تھا۔

اُس نے نصیرہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اپنی اُنگلیاں اس کے گرم بازوؤں پر آہستہ سے پیوست کر دیں۔ نصیرہ نے ہولے سے اسے دھکیلا مگر لطیف کی سخت اُنگلیاں اسکے نرم دہکتے ہوئے گوشت میں اور بھی سختی کے ساتھ مقفل ہو گئیں۔

"نہیں۔ نہیں۔ لطیف تم احمق ہو گئے کیا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں کہتی ہوں پرے ہٹ جاؤ!" نصیرہ کی آنکھیں بند ہو گئیں تاکہ لطیف کی طاقتور آنکھوں کی حرارت اُسے محسوس نہ ہونے پائے۔

اب کام لطیف کا تھا۔

مگر لطیف نے بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ پھرتی سے گھوما اور گھوم کر نصیرہ کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا اور نصیرہ کی روک تھام اور جسمانی احتجاج اور تشدّد کے باوجود لطیف اُسے کھینچکر پلنگ تک لے گیا اور پلنگ پر اُسے نیم دراز حالت میں ڈالکر چومنے لگا۔ جنونیوں کی طرح اُسے چومنے لگا۔ اُس نے اسکے لب، رخسار، ابروؤں، آنکھوں اور سینہ کو اپنے بھوکے لبوں کے "فرینکسٹینی" انداز سے بالکل زخمی کر دیا ۔۔۔!

نصیرہ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور انہیں لطیف کی آنکھوں میں اُلجھا دیا۔ لطیف کے ذرا اور بھینچنے پر اس نے گدگدی لگنے کا بہانہ کر کے

ایسا پُرخلوص اور مستانہ وار قہقہہ لگانا شروع کیا کہ لطیف یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ مرد کا لمس عورت کو کس قدر بے قابو کر سکتا ہے۔ نصیرہ نے آہستگی کے ساتھ دونوں ہاتھ لطیف کے گرد ڈال دئے۔ اُس کے موٹے موٹے سخت ہاتھوں اور سخت بالوں نے نصیرہ کو دیوانہ کر دیا۔ لطیف کے مکروہ چہرے کا بھدا پن عورت کے قریب ہونے کے احساسِ جمیل کے باعث اس وقت مفقود ہو چکا تھا۔ عورت کے دبوچنے سے اسکے چہرے پر جو تسکین و مسرت پھیلی تو وہ کمبخت "ناترے دیم کا کبڑا" اس وقت نصیرہ کو کچھ کچھ اچھا معلوم ہونے لگا ــــ!

"نصیرہ تم میری ہو اور ہمیشہ میری ہی رہو گی اور میں تمہیں ایسا خوش رکھونگا کہ بھول جاؤ گی پہلے کس طرح رہا کرتی تھیں۔ اب تم میری ہو جاؤ" لطیف اس طرح کہہ رہا تھا جیسے بخار چڑھ رہا ہو اور ہجران میں بک رہا ہو۔

نصیرہ پر خوف اور نامعلوم تھرتھری کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ بڑی دیر تک آنکھیں بند کئے اپنے جسم کو لطیف سے کھینچتی رہی! دراصل اور سپرد کرتی رہی!

اس کے بعد نصیرہ اکثر خوش رہنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھر نکھرنے لگا۔ ہونٹوں کو "دنداسے" کی سرخی سے وہ پھر "بوسہ طلب" بنانے لگی۔ کپڑوں کی طرف اس کی خاص توجّہ

ہوگئی اور اب وہ کبھی کبھی ذرا گنگنانے بھی لگی۔ وہ حیران تھی کہ اُسے سینما کے گیت کیوں پسند آنے لگے تھے "گانا نہیں یہ پیار ہے"! وہ اکثر گنگنا یا کرتی۔ لطیف اس کے گانے سے چپکے چپکے محظوظ ہوتا اور کام میں دل لگا رہتا۔ شریف نصیرہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کے حُسن کی دوسری دھنک طلوع ہوتے پر وہ باغ باغ تھا۔ مگر وہ اس باغبان کے مانند تھا جو اپنے لگائے ہوئے پھولوں کی سج دھج کو دیکھکر صرف دُور سے خوش ہوا کرتا ہے۔ اس کے لگائے ہوئے پھولوں سے جن کی سیجیں سجتی ہیں اور جسم و جاں آراستگی پاتے ہیں وہ اور ہی ہوتے ہیں۔ وہ ان پر رشک کرتا ہے کیونکہ اسکے سوا وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔

شریف نے دیکھا کہ نصیرہ اب بہت خوش رہنے لگی ہے مگر اس تبدیلی سے اُسے کوئی خاص شک بھی پیدا نہیں ہوا بلکہ اسکی جسمانی اور ذہنی کیفیت میں ایک اطمینان اور تسکین کا پہلو دیکھکر وہ خاموش ہوجاتا تھا مگر شریف کا یہ جی چاہتا تھا کہ نصیرہ کو دیکھے ہی جائے۔ اس کے چہرے پر نیا خون، اس کے سینے کی نئی پوشگی' اس کے لبوں پر نیا طوفانِ شرر یہ سب کس کے لئے تھا۔ اس کی دزدیدہ دزدیدہ نظروں کا تعاقب کیا لطیف کے لغزیدہ لغزیدہ قدموں کے لئے تھا! یہ شُبہ ابھی تک اسکے حاشیۂ خیال میں بھی آیا تھا۔

اب جاڑے آچکے تھے۔ شریف اور نصیرہ بلا وجہ اکیلے ایک

کمرہ میں سوتے تھے اور لنگڑے لطیف کو باہر کے دالان میں کرپچ کا پردہ ڈال کر سُلانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مگر اُسے وہاں سردی لگتی تھی اور اس کی لنگڑی ٹانگ میں اکثر درد ہو جاتا تھا اور وہ اب اس وجہ سے زیادہ ہونے لگا تھا کہ نصیرہ روٹی پکانے کے بعد تیل گرم کر کے اس کی ٹانگوں پر ملا کرتی تھی تاکہ درد دُور ہو جائے اور ٹخنوں سے لیکر کنجِ ران تک اس کا لمس گرم و حسین روغنی "مساج" لطیف کو یہ محسوس کرا دیا کرتا تھا کہ لنگڑا ہونا بعض دفعہ کیسی کیسی نعمتوں سے دوچار کرا دیتا ہے۔

ایک دن جب سٹر لیف "میل" جا چکا تھا، نصیرہ لطیف کے پاس آئی اور جبکہ وہ ایک شکنجے میں ایک موٹی سی کتاب رکھکر اس کے اوراق تراشنے والا ہی تھا کہ نصیرہ نے پیچھے سے آکر اُس کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ لطیف نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا اور اپنے مکروہ چہرے کے پورے بھدے پن کے ساتھ وہ نصیرہ کو مسرور و شاداں دیکھکر مسکرا دیا۔

نصیرہ کا ہاتھ اُس نے اپنے ریچھ نما ہاتھ میں لیکر ایسی کرختگی کے ساتھ بھینچا کہ نصیرہ تلملا گئی۔ مگر اس وقت نصیرہ کے دماغ پر بس ایک ہی خیال طاری تھا اور وہ اسی خیال کو کئی روز سے ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ آج وہ کہنے کے لئے آمادہ ہو ہی گئی۔

"سنتے ہو لطیف!"

"کیا؟"

"ذرا خبردار ہو جاؤ۔"

"کچھ مُنہ سے بھی کہو گی؟"

"اب کہنے کی بھی ضرورت رہ گئی ہے۔"

"کیا ہوا۔ کیا؟؟"

"ہوتا کیا یہ سب تمہارا وحشی پن ہے۔ دو مہینے ـــ" نصیرہ کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"دو مہینے چڑھ گئے۔"

"ہاں ـــ"

"تو پھر فکر کی کیا بات ہے۔ اللہ مالک ہے۔ خدا نے جہاں وہ مشکلیں آسان کر دیں وہاں یہ بھی آسان ہو جائے گی۔ مجھے پبلک لائبریری کی کتابوں کا کام بنانے کے لئے مل جائے تو دو مہینے کیا دو سو مہینے کا کرایہ چڑھ گیا ہو تو اُتار دوں۔"

نصیرہ نے آہستہ سے اس کی پیٹھ پر نرم سا دو ہتڑ مارا۔

"ارے میں کیا کہہ رہی ہوں تم کیا سمجھ رہے ہو۔ کہو کھیت کی سنتے ہو کھلیان کی؟"

"ہاں۔ ہاں میں سب سمجھ گیا دو مہینے کرایہ دار کے ـــ"

"تم تو بالکل بدھو ہو۔ دو مہینے کرایہ دار کے نہیں چڑھے بلکہ ...... میں ......"

"اچھا۔ اچھا۔ تم یہ کہہ رہی تھیں!" لطیف ایک دفعہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ معاملہ کس سنگین حد کو پہونچ گیا ہے۔ مگر جیسے کسی نے اس کے سوئی چبھو دی ہو وہ کسی نامعلوم اشتعال سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنی لنگڑی ٹانگ کی سعادت مند اعانت سے سارے کمرے میں ناچنے لگا۔ قہقہے لگانے لگا۔ اس کا دماغ چل گیا تھا۔ نصیرہ کو کچھ ڈر لگنے لگا۔

"نصیرہ! مبارک ہو! ارے ہم بھی آخر کچھ ہیں۔ مٹھائی کھلواؤ۔ خدا نے مجھے اور تمہیں والدین بنا دیا —— ارے یہ ہماری اولاد ہوگی۔ میری اپنی اولاد۔ اوہو! میری یہ قسمت کہاں تھی۔ موٹے بھدّے لنگڑے کا مذاق اُڑانے والے ذرا دیکھیں نصیرہ میرے لئے ہے اور اس نے مجھے ایک بچّہ دینے کی خوشخبری دی ہے۔ بھلا کیسے اُمید تھی کہ میں بھی باپ ہو سکتا ہوں۔ نصیرہ چُپ کیوں ہو۔ ارے خوش ہو! اب تم یہ نہیں پوچھ سکو گی کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔ زندگی کا مطلب تو اَب سمجھ میں آگیا ہوگا۔ زندگی یہ ہے کہ مستی کو ہستی میں تبدیل کر دیا جائے۔ یعنی آدمی کو جب مستی آئے تو وہ کسی سے پیار کرے۔ اور پیارسے بچّے بنالے۔ بچّے کا مطلب ہے کہ وہ پھر پیدا ہو گیا۔ وہ بچّہ پھر کسی کو پیدا کریگا۔ بس یونہی سلسلہ چلتا رہیگا۔ یہی زندگی ہے"

عورت کی سمجھداری نے مرد کی بے تحاشہ جذبات پروری پر آخرکار پھر فتح پائی اور وہ بولی "میں پوچھتی ہوں کہ تم آپے سے کیوں

باہر ہو جایا کرتے ہو۔"

"نہیں تو کیا کروں؟"

"میں پوچھتی ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اگر تمہارے بھائی صاحب کو پتہ چلا تو کیا ہوگا۔ ہم اب اُن کے ساتھ کس طرح رہ سکتے ہیں۔ کہیں چلنا چاہیئے؟"

لطیف بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر نصیرہ کو لپٹا کر کہنے لگا:

"مری جان تم ہراساں مت ہو میں سب انتظام کر لونگا۔ واقعی ہمیں یہاں سے اب کہیں چلا جانا چاہیئے۔ ہم تینوں، اب ہم اپنا ایک گھر بسائینگے ہم تینوں۔ میں، تم اور یہ ــــ!" کہتے کہتے اُس نے شوخی سے نصیرہ کے نرم پیٹ پر اُنگلی چھوئی اور وہ ایک آہ سرد بھر کر پیچھے ہٹ گئی۔

نصیرہ کے چہرے پر ایک لوہیت کا نور پھیلا ہوا تھا۔ اُسے ماں بننے کے شوقِ بے پایاں نے اپنی کامیابی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ "ہم تینوں!" یہ لفظ جب اس کے دماغ میں گونجے تو ایسی مطمئن و مسرور ہوئی کہ آج تک نہ ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ اور چپکے چپکے دونوں نے بھاگنے اور کہیں چلکر رہنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ روز مشورے اور سرگوشیاں ہوتیں اور منصوبے گانٹھے جاتے۔ طرح طرح کی باتیں سوچ کر اُن کے رد اور قبول کی وجوہات سمجھی جاتیں۔ غرض کئی دن کھچڑی پکنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ نصیرہ اور لطیف کہیں چلے جائیں۔

ایک دن شام کو جب شریف کارخانہ سے واپس آیا تو گھر میں معمول کے خلاف ایک عجیب خاموشی سی طاری تھی۔ وہ آتے ہی نصیرہ کو آوازیں دیا کرتا تھا۔

"ہاں سن لیا آتی ہوں!" کی صورت میں آج کسی نے اسے جواب نہیں دیا۔

شریف کبھی اس کمرے میں گھسا کبھی اس کوٹھری میں۔ کبھی چھت پر گیا کبھی اس نے پاخانہ میں جھانکا۔ نہ لطیف دکھائی دیا نہ نصیرہ۔ یہ دونوں کے دونوں آخر کہاں چلے گئے تھے۔ وہ حیران اور پریشان ہو کر دالان میں ٹہلنے لگا۔ بیچ کے طاق میں اس کی نظر پڑی تو چاء کی پیالیوں، خوبصورت گلدانوں اور شیشے کے گلدستوں سے سجے ہوئے اس طاق میں اسے ایک کاغذ کا پرزہ صابن دانی میں الگ رکھا ہوا نظر پڑا۔ یہ کیا تھا، اٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا "ہم تینوں جا رہے ہیں۔ اور اب ایک ہی جگہ رہیں گے۔ تینوں — ہم تینوں —!"

شریف کی سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ مگر نصیرہ کو ماں بنتے دیکھنے کی مسرت نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اس کی جلن بھی جاتی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ نصیرہ بچاری کیا کرتی۔ لطیف کو وہ کیسے برا بھلا کہتا۔ جو کچھ ہوا اسکے سوا اس گھر میں ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مگر یہ دونوں بیوقوف ہیں۔ خاصکر نصیرہ۔ وہ چلی گئی۔ کیوں چلی گئی؟

شریف سوچنے لگا کہ نصیرہ نے مجھے اچھی طرح سمجھا نہیں۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ کاش نصیرہ خوش و خرم ہو سکے اور قدرت نے مجھے جس چیز سے سفاکی کے ساتھ محروم کر دیا تھا نصیرہ کو ماں بننے سے مایوس کر دیا تھا وہ دامن مراد پھر بھر جائے میں تو اسے سکھی دیکھکر خود ہی مگن ہو جاتا۔ مری حالت میں جو لاچار ہو وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ میں اس کے بچے کو کوئی غیر کا بچہ تو نہ سمجھتا۔ لطیف کا بچہ مگر میری نصیرہ کے پیٹ سے! آنکھیں سکھ، کلیجہ ٹھنڈا! دوست کا بچہ ہے میری بیوی کے بطن سے ـــــ میں اگر ایک مرد ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی اور جب میں مرد نہیں ہوں تو دوست کی اس حرکت کو بے وفائی اور عورت کے قدرتی تقاضہ کو میں لغزش کیوں سمجھوں۔ وہ اب دونوں کو ـــــ بلکہ اسے بھی اب یہی کہنا چاہئے کہ ان تینوں کو کہاں جا کر تلاش کرے ـــــ چلے گئے۔ میں اُن کا بگاڑ کیا سکتا تھا کہ ڈر کر بھاگ گئے۔ ارے بھئی نامرد آدمی بھی کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے! غیرت، غصہ، تیزی، جذبۂ انتقام، جنسی حسد سب جاتا رہتا ہے جب مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر نصیرہ کیوں جھینپی اور لطیف احمق کیوں ڈر کر بھاگا۔ میں اُنکو اور اُنکے بچے کو پھر کلیجہ سے لگا لیتا۔

یہ سب باتیں سوچکر شریف کا دل بھر آیا۔ نصیرہ آج تک اس سے جُدا نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی اُسے ایسی شاق گذری کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــــ "نصیرہ! نصیرہ!" کہتا ہوا وہ

باورچی خانہ میں گیا اور جس پیڑھی پر بیٹھ کر وہ روٹی پکایا کرتی تھی، جس بیلن سے وہ روٹی بیلتی تھی اُسے سینے سے چمٹا کر شریف اس قدر رویا اور اس پر ایسا دورۂ غم و فسردگی طاری ہوا کہ اُسے ہوش نہیں رہا۔۔۔ ہائے نفیرہ ‟ وہ آکر پلنگ کی پٹی سے ایسا ٹکرایا کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

باب ۔۲۔

مزدوروں کی بستی میں اگر کسی کی بیوی بھاگ جائے اور وہ بھی کسی بڑے مزدور کی، تو سب کو خبر ہو جاتی ہے۔ شریف کی بیوی اسکے دوست کے ساتھ جو گھر میں رہتا تھا، بھاگ گئی، ایک ایسی خبر تھی جسے ہر ایک نے غور سے سُنا اور بڑے چاؤ سے اُسے دل میں جگہ دی۔ "مِل" کے لوگ شریف کو طرح طرح کے سوالوں سے پریشان کیا کرتے تھے مگر وہ حیلے بہانے کر کے ٹال دیا کرتا تھا۔ بعض بعض نے تو یہاں تک تجویز کر دی کہ دوسرا نکاح کر لو۔ میرے چچا کے پھوپی زاد بھائی کی خالہ کی لڑکی شادی کے لئے جوان بیٹھی ہے اور "شریفوں" کا انتظار کر رہی ہے۔ اتنا بڑا مکان اب تم نے کیوں لے رکھا ہے۔ چھوڑ چھاڑ دو، یار دو چار روپے کی کوئی کوٹھری لے لو۔ وہاں مزے سے رہو۔ تنخواہ

کافی ملتی ہے۔ موقع بے موقع کوئی مل جائے تو اپنی کوٹھری میں لے آئے۔ ایک آدھ دفعہ مہینہ میں یہ سلسلہ چلتا رہے۔ بیوی بچوں کے روگ میں دوبارہ نہ پڑنا ــــ" بعض بعض "ذاتِ شریف" قسم کے ہمدردوں کا یہ بھی مشورہ تھا!

مگر نہیں شریف کا صرف جذبۂ مردانگی ہی مفقود ہوا تھا! احساسِ شرافت تو ویسا ہی تھا۔ اگر نصیرہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی تو کیا ہے کسی دن وہ لوٹ کر بھی آسکتی ہے۔ اس لئے وہ یہ گھر نہیں چھوڑ سکتا تھا جس دن وہ گھر سے گئی ہے اور گھر کی جو حالت چھوڑ کر گئی ہے بالکل اسی طرح مکان رہنا چاہیئے۔ نہ جانے وہ کب آنکلے۔ گھر ویسا ہی رہنا چاہیئے۔ اُسے افسوس اس بات کا تھا کہ نصیرہ کا پتہ چلنا مشکل تھا ورنہ وہ اُس کی مصیبت کے وقت مدد کو پہونچنے کے لئے بھی تیار تھا۔

اب شریف نے اپنا کام خود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا کیونکہ اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ برتن مانجھنا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، روٹی پکانا، سبزی والوں سے جھگڑنا اُسے سیکھنا پڑا۔ دودھ والے کے حساب کی غلطیاں اُسے اب معلوم ہونی شروع ہوئیں۔ گرم پتیلی کو چولھے سے اُتارنے میں بیویوں کے ہاتھ کس طرح جلتے ہیں یہ اُسے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا۔ پیوند پارہ لگاتے وقت سُوئی کپڑے سے نکل کر گوشت میں بھی پہونچ جاتی ہے اُسے پہلی اتوار کو

ہی معلوم ہو گیا تھا۔

مل کے ایک مزدور نے اس سے کہا کہ تم اتنے بڑے مکان میں اکیلے رہتے ہو۔ میں بھی اکیلا ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔ مگر اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ کسی کو اپنے مکان میں رکھے۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جس تخت پر لطیف سویا کرتا تھا وہاں کوئی دوسرا آدمی سوئے۔ جس بنچ پر بیٹھ کر وہ شطرنج کھیلا کرتے تھے کوئی دوسرا آدمی اُس پر آکر بیٹھے۔ اس لئے اُس نے کسی کو اپنے ساتھ گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔

اتوار کا دن چھٹی کا ہوتا تھا۔ اُسے کاٹنا اجیرن ہو جاتا تھا۔ اب اُسے یاد آتا تھا کہ بغیر دوست کے شطرنج کارِ بیکاراں ہے اور جب تک کوئی نصیرہ پلنگ پر بیٹھ کر چھالیہ نہ کترے اور اس کی چوڑیوں کی آواز سے ترنم نہ پیدا ہو، اتوار کے دن آرام کرنا عبث ہے۔ اب اُسے احساس ہوا کہ اُس کی زندگی کا سکھ چین ان دو دوستوں کا کہاں تک مرہونِ منت تھا اور ان کے بغیر وہ کیسا بیوقوف سا شریف معلوم ہونے لگتا ہے!

نصیرہ نے جو گملے رکھ چھوڑے تھے وہ اُسے عزیز تھے۔ اُن میں صبح کو پانی ڈال جاتا تھا اور شام کو آکر پھر ڈالتا تھا۔ جس طرح مجاور قبر کو صاف ستھرا رکھ کر پھول چڑھاتا ہے اسی طرح شریف بھی چھت پر چھڑکاؤ کر کے پلنگ بچھا دیا کرتا تھا کہ نہ معلوم نصیرہ کب آجائے۔

ـــ حقیقت میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ مگر مکمل پاگل پن سے بچنے کے لئے اُسے ایک شغل کی ضرورت تھی اس لئے ان چیزوں سے اپنی تنہائی کی تکلیف کو کم کیا کرتا تھا۔

کئی مہینے اس تنہائی کو گذر گئے۔ جاڑے آ گئے۔ اس لئے اور بھی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ سوچا کرتا تھا یہ دونوں، تینوں چلے گئے۔ مجھے چھوڑ کر چلے گئے!۔

بعض دفعہ اُسے یہ خیال آتا کہ شراب پی کر غم غلط کرنا بھی ایک چیز ہے۔ مگر وہ شراب پی کر غم غلط کیوں کرے۔ غم غلط کرنے سے وہ اُنہیں بھول سکتا ہے اور بھول جانا اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی روٹی پکا کر اور کھا کر اور خود برتن صاف کر کے اپنی تنہائی کو لیکر لیٹ جاتا تھا۔ انتظار۔ انتظار۔ انتظار کئے جا رہا تھا۔ جس طرح نصیرہ اور لطیف نے اپنے موقع کا انتظار کیا تھا۔ شریف بھی اس انتظار میں تھا کہ کوئی "موقع" ایسا آئیگا کہ وہ تین پھر ایک جگہ ہونگے!

جب کوئی اور شغل اور دلچسپی نہ ہو تو آدمی اپنے پیشے ہی میں دل لگا لیتا ہے بلکہ مغز کھپانے لگتا ہے۔ مشین کے پُرزوں سے اُس کی واقفیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کی رفتارِ ترقی دیکھکر مالکانِ مل نے اُسے ایک بڑی ورکشاپ کا انچارج کر دیا۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا غم بھی بڑھ گیا تھا۔ یہ سب تنخواہ لیجا کر

کیسے دے. کون اسے خرچ کرے. کون اس کا حساب رکھے. وہ اپنے خرچ کے پیسے کس سے مانگا کرے. کون اُسے پیسے دینے پر شوخ طبعی سے انکار کرے، وہ اس پر کس سے بگڑے ــــ یہ سب سوچکر شریف کا دل بھر آتا تھا اور وہ روپوں کا بٹوہ گھر میں لاکر پٹخ دیا کرتا تھا. جیسے وہ حرام کی کمائی تھی. حلال کی کمائی شکیہ سے نہ خرچ کی جاسکے تو روح کو لقمہ حرام کی مانند زہر آلود معلوم ہونے لگتی ہے.

مل کی لائبریری سے اُس نے کتابیں لاکر پڑھنی شروع کیں. ان میں سے کوئی کوئی کتاب اسکی سمجھ میں بھی آجاتی تھی. ناول سے اُسے دلچسپی تھی. اکثر وہ جاسوسی ناول شوق سے پڑھا کرتا تھا. ایک ناول کو کئی کئی بار پڑھا کرتا تھا.

شام ہوئی اور اُس نے اپنی "نیلی چھتری" کھولی اور گوشۂ عافیت میں سنبھلکر بیٹھ گیا. نیند آنے لگتی تو پڑکر سوجاتا اور صبح کو پھر کارخانہ چلدیتا. غرض صبح و شام اسی طرح گذر رہے تھے.

ایک ہفتہ کی رات کو وہ تیرتھ رام فیروزی کا "آتشیں کتا" پڑھ رہا تھا کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی. اس کا بھلا کون ملنے والا ہوسکتا ہے. یقیناً کسی نے غلطی سے دستک دی تھی. اس لئے وہ چپ چاپ پڑھتا رہا اور کوئی جواب نہیں دیا. دستک پھر دی گئی اور زور زور تیقن کے ساتھ. اب تو اُسے لامحالہ اُٹھنا ہی پڑا. اُسے اپنی تنہائی کے اس طرح مجروح ہوجانے کا کافی صدمہ ہوا. مگر خیر

دروازہ کھولا۔ سامنے دیکھا تو ایک مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ وہ انہیں
بس یونہی جانتا تھا۔ وہ ہندو راؤ کے باڑے میں شیخوں والی مسجد
کے امام تھے۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

"اوہ مولانا آپ ہیں! تشریف لے آئیے" کہکر اس نے
تپاک کے ساتھ مولوی عبدالاحد صاحب کو اندر آنے کا اشارہ
کیا اور مصافحہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مولانا عبدالاحد کیلئے
اس نے جلدی جلدی چاء بنائی اور جب وہ پی چکے تو اس نے
پوچھا: "مولانا کیسے تکلیف فرمائی؟"

"ارے بھئی مجھے آپ جانتے نہیں میں تو ——— عبدالاحد
نام ہے میرا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ کچھ عرصہ ہوا میرے پاس آپ کے
کارخانہ کے چند لوگ میلاد شریف کے لئے بلاوا دینے آئے تھے۔
انہوں نے آپ کا بھی ذکر کیا۔ میں نے جواب دیا کہ وہ تو میرے ضلع
کے آدمی ہیں میں انہیں جانتا ہوں۔ منشی صدیق حسن کے نواسے
ہیں وہ میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ پھر باتوں باتوں میں مجھے یہ
بھی معلوم ہوا تھا کہ آپ کے گھر میں سے ——— خیر وہ سب کہنے
کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے رفتہ رفتہ سب قصہ معلوم ہو گیا۔ بڑا افسوس
ہوا تھا۔ لطیف اور آپ کے گھر میں سے ———"

"ہاں. ان کا کیا ہوا. وہ کہاں ہیں؟" شریف گھبرا کر بولا۔
"میں نے ان کا پتہ چلایا اور یہ سوچا کہ اُن سے جا کر کہوں کہ بھئی یہ کیا نازیبا حرکت ہے. اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور میاں بیوی میں مصالحت کرا دی جائے. میں نے پتہ معلوم کر کے وہیں کا رُخ کیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ــــ"
"کیا معلوم ہوا مولانا؟" شریف نے پھر بیتابی سے پوچھا اور بیحد بیقرار ہو گیا۔
"معلوم ہوا کہ آپ کے گھر میں" سے "کے ہاں لڑکی ہوئی ہے!"
"لڑکی ہوئی ہے!" شریف بیحد پریشان ہوا۔
آخر کار نصیرہ کو اولاد کی نعمت مل گئی. وہ اولاد جو وہ اُسے نہ دے سکا تھا اور نہ دے سکتا تھا!
شریف دالان میں ٹہل رہا تھا. کبھی گملہ کی طرف دیکھ رہا تھا. کبھی اس میں کھلی ہوئی ایک جنبیلی کی ننھی سی کلی کو جو آج ہی رات اُس نے غور سے دیکھی تھی. اُسے یقین نہ آتا تھا کہ نصیرہ زندہ ہے. نصیرہ صاحب اولاد ہو گئی ہے اور یہ سب قصّہ وہ اپنے کانوں سے سُن رہا ہے. وہ دل ہی دل میں کہنے لگا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا. مولانا کی آنکھ بچا کر اُس نے دیوار کو چھو کر دیکھا. وہ دیوار ہی تھی. مولانا اپنی جگہ پر بیٹھے تھے. دس بجے کی "شفٹ" کی سیٹی میل میں سے آ رہی تھی. یہ سب خواب نہیں ہو سکتا تھا.

مولانا فرما رہے تھے:۔

"تو صاحب میں نے جا کر اس نیکبخت کو سمجھایا اور اُسے آتشِ دوزخ سے ڈرایا۔ وہ رونے لگی۔ میں نے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہتی ہو——"

"تو وہ کیا بولی—— ہاں مولانا یہ تو فرمائیے لطیفن کہاں ہے۔ کیسا ہے؟"

"لطیفن کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور چونکہ وہ بہت عرصہ سے بیمار ہے اس لئے دونوں کی حالت بہت سقیم ہے اور اُن پر قہرِ الٰہی نازل ہے۔ آج کل پیسوں کی طرف سے سخت پریشان ہیں۔ مجھ سے وہ کہتی تھیں کہ مسجد فتحپوری سے قرض حسنہ دلوادو۔"

"مجھے تو وہ نہیں پوچھتی تھی؟" شریف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں۔ مرے عزیز۔ آپ کا نام تو اس نیکبخت کی زبان سے ایک دفعہ بھی نہیں سُنا۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس کی مدد کر سکتا ہوں مگر جب اُسے میرا اتنا سا بھی خیال نہیں ہے تو میں اسکے پاس جا کر کیا کروں۔" شریف نے تاؤ دکھا کر کہا۔

مگر مولانا کی نیک طبعی ملاحظہ ہو کہ مصالحت کا بیڑا اُٹھا کر آئے تھے بولے:" نہیں بھئی یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اسکے پاس

خود جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُسے شرم آجائیگی اور وہ اپنے گناہوں کی توبہ کرکے تمہارے ساتھ واپس آجائے گی ـــــ تم میرے ساتھ چلنا میں تمہیں لے چلونگا۔"

شریف کے دل میں ایک ہڑک اٹھی۔ نصیرہ کو دیکھے ہوئے دس مہینے ہو چکے تھے۔ مگر اُسے ڈر تھا کہ اگر نصیرہ شرم سے غرق ہو گئی تو میں کیا کروں گا۔ میں اس کی خجالت کو کیسے دیکھ سکوں گا۔ وہ اس سے کس طرح بات کرے گی۔ بہت ممکن ہے بات ہی نہ کرے۔ ملنے سے ہی انکار کردے۔

"نہیں مولانا مجھے تو آپ معاف ہی کریں ـــــ البتہ آپ ان کے لئے کچھ روپے لے جائیے۔ اس وقت ان کی یہی مدد کر سکتا ہوں۔ صبح کو اور روپے کا بندوبست کر دونگا مگر میں خود نہیں جاؤنگا۔ گھر کے لئے اناج، ایندھن اور جس چیز کی ضرورت ہو وہ انہیں منگا دیجئے۔ میرا اُن کا اب کوئی سروکار نہیں۔ ہاں اس وقت انہیں میری مدد کی ضرورت ہے، تو یہ حاضر خدمت ہے، اس میں دریغ نہیں کر سکتا۔"

مولانا نے ہاتھ ہلا کر انکار کرتے ہوئے کہا: "ابھی اسے رکھو۔ اس وقت دیر ہو گئی ہے۔ اس وقت رات زیادہ آچکی ہے میں اتنی دور نہیں جا سکتا۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے اور بڑی اچھی سمجھ ہے، مجھے اسکی توقع نہ تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت اور دوستی کا حق ادا کر دیا اور ان دونوں کو خوش دیکھنے کے لئے اپنے آرام کو بھی خیرباد کہدیا۔

ایسی آسمانی مثالیں میں نے کم دیکھی ہیں۔ رہ گیا ان دونوں کا گناہ تو خدا انہیں معاف کرے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ خود اُن کے پاس چلے جائیں اور راہِ مصالحت پیدا کرلیں۔ میں صبح کو آپ کے پاس آؤنگا۔ مگر ان کا پتہ آپ کو بتادوں یہ ہے ـــــ"

یہ کہہ کر مولانا نے ایک کاغذ کے پُرزے پر پتہ لکھنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے مصافحہ کیا اور چلے گئے۔

آرام۔ آرام۔ شریف کے لئے بھلا آرام کہاں لکھا تھا۔ آج کی رات وہ بھلا کیا آرام کرسکتا تھا۔ صبح تک کون انتظار کرے ابھی چلنا چاہیے اسے اب ایک منٹ کی بھی تاب نہیں تھی۔ اسے آج تک معلوم نہ ہوا تھا کہ نصیرہ اور لطیف دلی ہی میں ہیں۔

اُس نے آخری ٹرام پکڑ لی اور جامع مسجد پہونچا۔ بتائے ہوئے پتہ پر ڈھونڈتا ڈھونڈتا مکان پر پہونچا۔ ایک چھوٹا سا مکان بھوجلہ پہاڑی پر درزیوں کی گلی میں اُسے بتایا گیا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

تو یہ مکان ہے جس میں نصیرہ اور اس کا دوست لطیف رہتے ہیں۔ شریف پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ دروازے پر کھڑا کھڑا وہ کپکپانے لگا۔ اس کی آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ کیسے آواز دے۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ نصیرہ کہہ کر آواز دے مگر محلہ والوں کا خیال کرکے چپ ہوگیا۔ تو بس یہ چھلنی جیسا چھید دار پردہ ہے جس کے پیچھے وہ ہستی رہتی ہے جسے

وہ اپنے لئے دنیا کی عزیز ترین شے سمجھتا ہے۔ کیا اندر گھس جائے۔ دروازہ تو کھٹکھٹانا ہی چاہیئے۔ اگر کسی نے نہ سُنا تو کیا فائدہ۔ نصیرہ کو دیکھنے کے شوقِ بیتاب نے اُس کی کمزوری پر قابو پالیا اور اُسے حیرت ہوئی کہ وہ دیوانہ اندر گھستا ہی چلا گیا۔

اُس کی بھوکی نظریں سامنے آجانے والی ہر چیز کو ہڑپ کر جانا چاہتی تھیں۔ معمولی سا مکان، چھوٹا سا دالان، بوسیدہ بوریہ، اس پر ایک جھلنگا پلنگ، ایک طرف چنگیری اوندھی پڑی ہوئی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک روٹی پکی نہیں ہے یا اتنی قلیل پکی تھی کہ ایک ٹکڑا بھی فالتو نہیں بچا۔ اب اس کی آنکھیں ایک جگہ آکر ٹھہریں۔ اوہو یہ ہے نصیرہ! ـــــ ایک طرف کونے میں بیٹھی ہوئی۔ نصیرہ اُسے کیسی اچھی معلوم ہوئی۔ ایک ننھا سا بچہ اس کی کھلی ہوئی چھاتی میں اپنا بھوکا منہ گھسیڑے دے رہا تھا!

یہ نظارہ دیکھکر شریف میں ایک نوع کا جذبۂ مہر و رحم پیدا ہو گیا وہ بہت ہولے ہولے آگے بڑھا۔ نصیرہ کی طرف بڑھا۔ نصیرہ نے آنکھ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ عورت کی آنکھیں نڈر، بے خوف، جری اور بے پروا تھیں۔ مرد کی نگاہیں رحم اور مہر و تپاک سے لبریز تھیں۔ نصیرہ پر ایک طوفانی کیفیت گذر گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی بے رحم ہاتھ نے اُسے حقیقت زندگی کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ جیسے شیر کے آگے بکرہ ڈالدیا جائے۔

اس کے خوابِ زندگی کیا تھے کیا ہو گئے۔ اسے اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ جو یاد آ رہا تھا وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور جو سمجھ میں آ رہا تھا اُسے ادا کرنے میں زبان یاوری نہ کر رہی تھی۔

شریف نے سوچا کہ نصیرہ کی جری آنکھیں اس کے سارے سوالوں کا جواب ہیں۔ اُس کے دیدوں کا پانی ڈھل چکا ہے۔ اس ظلمات میں اب آبِ حیواں کی تلاش فضول ہے اس لئے سیدھی سیدھی بات کرنی چاہیئے۔ اگر جلی کٹی باتیں کیں تو نصیرہ کے پاس جو سوال ہے اس کا جواب اس کے پاس نہیں ہے۔ نصیرہ پوچھتی کہ وہ ایسی حالت میں اور کیا کرتی ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایسا سوال کر بیٹھے تو اسکے پاس کیا جواب ہے۔

”نصیرہ میں تو تمہیں لینے آیا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہاری جو مدد کر سکتا ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ مجھے دھتکارنا نہیں۔ میں بڑی آرزو لیکر آیا ہوں۔ گذری ہوئی کہانی کا فکر نہ کرو۔ ہم جیسے تھے ویسے ہی پھر ہو سکتے ہیں“

نصیرہ کے چہرے پر بے پروائی کی زردی سی پھیلی ہوئی تھی جیسے پیلی مٹی سے کوئی دیوار پوتی گئی ہو۔

کونے میں لگی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کر کے اُس نے کہا ”چپ! دم نکلنے ہی والا ہے! آخری سانس سمجھو“

نصیرہ کی آواز میں ایک ایسا آہنگِ غم تھا کہ جس سے سارا کمرہ

جھنجھنا اُٹھا۔ شریف آہستہ سے آگے بڑھا اور پلنگ کی پٹی سے جا کر لپٹ گیا۔ کیا واقعی یہ وہی لطیف تھا۔ زرد، مرجھایا ہوا مرض الموت سے کچلا ہوا جسم۔ کیا یہی اس کا دوست تھا جس کی گرم و تند جوانی نے نصیرہ کی عصمت کے پاؤں اکھیڑ دیئے تھے۔

شریف کی آنکھوں کے سامنے موتیوں کی سی جھالر لٹک رہی تھی۔ غبارِ اشک سے آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے ٹٹول کر اپنے دوست کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ـــــ "لطیف!" کہہ کر اس نے اپنے آپکو پلنگ پر گرا دیا۔

مریض نے آنکھ کھولی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُٹھنے کی تاب اب باقی نہ رہی تھی۔ شریف نے اُسے سہارا دیکر اُٹھایا۔ لطیف نے بڑی مشکل سے کہا: "شریف!"

اس ایک لفظ میں بہت کچھ تھا۔ لطیف کی خجالت، شریف دوست کے آنیکا انتظار، اس کی محبت اور اشتیاقِ ملاقات۔ غرض اس میں لطیف نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"لطیف! لطیف! ذرا آنکھیں کھولو، بھئی میں ہوں شریف۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں، گھر چلو۔"

"گھر!" لطیف کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ موت سے پہلے آجانے والی ایک قسم کی طمانیتِ روحی اس کے چہرے پر، صبح کے نور کی طرح پھیلی ہوئی تھی ـــ "گھر!ـــ

ہاں۔ جاتا تو ہوں۔ جا رہا ہوں بھئی۔ تم جلدی نہ کرو۔ مَیں گھر تو جا ہی رہا ہوں۔ مگر میں ایسے گھر جا رہا ہوں جہاں سے واپس نہیں آؤنگا۔ شریف میں جا رہا ہوں اور تنہا ہی جاؤں گا۔ اس لیئے آخری التجا ہے کہ بھئی مجھ اور نصیرہ کو معاف کر دینا۔ ہم دونوں نے تمہیں بڑا دُکھ پہونچایا۔ نصیرہ کی خبرگیری کرتے رہنا اور ہماری جو ننھی ہے اس کی بھی —— یا مَیں حد سے بڑھ رہا ہوں۔ اگر بُرا مانو تو بھائی ابھی کہدو، اُس دُنیا میں مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔ میں تمہارے سامنے اپنا سر نہیں اُٹھا سکتا۔ مجھے خدا معاف کرے۔ مجھے تم معاف کر ——"

اُسکی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسکی طاقت تو پہلے ہی سلب ہو رہی تھی۔ زیادہ بولنے سے اُسے اور بھی صدمہ پہونچا۔ شریف نے اسے گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔ جوش میں اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ مر رہا ہے۔ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔

"میری تو زندگی اب نصیرہ کے لئے ہی وقف رہے گی۔ مجھے اس سے اُنسیت ہے۔ اور اس واقعہ سے میں متاثر ضرور ہوا ہوں، مگر جب اس کے سبب پر نظر ڈالتا ہوں تو معاف کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ میری تو اس زندگی کی بس ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ نصیرہ سے دوبارہ میل ملاپ ہو جائے اور ہم پھر ایک ہی جگہ رہنے لگیں۔ رہ گئی ننھی تو وہ میری نصیرہ کی بیٹی ہے۔ میں نصیرہ کو چاہتا ہوں اور ہر طرح اس کی خبرگیری کرونگا تو تمہاری لڑکی کی بھی کرونگا۔ تم اچھے

ہو جاؤ گے۔ فکر نہ کرو چلو گھر چلیں۔"

"گھر آ گیا ——— !" لطیف کے منہ سے ایسی مدھم سی آواز نکلی جیسے وہ کسی سمندر میں ڈوب چکا ہو۔ شریف نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا مگر لطیف اس کی گود میں زندگی کا اگلا سانس لینے سے انکار کر چکا تھا ——— !

نصیرہ کا غم زبان سے ادا ہونے والا نہ تھا۔ وہ گونگی ہو گئی تھی اور اُسے ایسا صدمہ تھا کہ آنسو بھی خشک تھے اور آہ و زاری بھی اُسے یاد نہ آ رہی تھی۔ صرف اسکی آنکھوں میں غم نصیبی کا افسانہ جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ اسکی آنکھوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوچھ رہی ہیں میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ تقدیر کی ستم ظریفیوں کی حد جا کر کہاں ختم ہوتی ہے ——— ؟

دوسرے روز شریف نے سوچا کہ اب یہ بات فوراً معلوم کر لینی چاہیئے کہ آئندہ نصیرہ کا کیا خیال ہے۔ اُس نے دبی زبان سے آئندہ کی بات چھیڑی۔ نصیرہ کافی دلیر ہو چکی تھی اس لئے اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شریف سے صاف صاف بات کرنی شروع کر دی اور آئندہ کیلئے وہ کیا چاہتی ہے اچھی طرح واضح کر دیا۔

"لطیف کو مجھ سے ایسی محبت تھی کہ کم عورتوں کو یہ نعمت ملی ہوگی۔" اس کی آواز میں فخر تھا۔ "میں اس کی محبت کو اس وقت بھول جاؤں

تو کھیتی ہے۔ اُس نے مجھے اپنا سب کچھ دیدیا تھا۔ میں جس چیز کے لئے مرتی تھی وہ چھینی چیز مجھے دیدی۔ مجھے صاحب اولاد کر دیا۔ اب کوئی چیز مجھے اُس سے نہیں چھڑا سکتی۔ موت بھی مجھے اس سے الگ نہیں کر سکتی۔ یہ میری ہے اور سدا میری ہی رہیگی"

نصیرہ نے جس بیباکی اور جرأت آموزی کے ساتھ صاف صاف باتیں کیں شریف کو اُن کے سامنے سرِ تسلیم و رضا خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اُس نے نصیرہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ موت نے ان تینوں کے ماضی کو دھو دیا تھا، مگر قدرت نے لطیف کو اپنے پاس بلا کر مستقبل کی بھی بنیاد ڈالدی تھی۔ بنیاد یہ تھی کہ شریف کو اس کی نصیرہ پھر واپس مل جائے۔ یہ جامۂ قدرت ایسی ہی آڑی ترچھی بافتوں سے بُنا ہوا ہے۔ ایک بات سے نئی نئی باتیں نکلتی ہیں۔ ممکن ہے نصیرہ جیسی چیز شریف کو واپس دلانے کیلئے ہی قدرت نے لطیف کو اپنے پاس بلایا ہو۔

"نصیرہ تمہارا گھر موجود ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے اپنا گھر موجود ہے۔ تم چل سکتی ہو!"

شریف نے فوراً سوال کر دیا کہ اس سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا تھا۔ جواب کا بیقراری سے انتظار کر رہا تھا۔ امید و بیم کی گھڑی آچکی تھی۔ اس کا سانس رُکنے لگا۔

"میں گھر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں اور ننھی دونوں چلیں گے"

نصیرہ نے بلا تامّل کہا، جیسے وہ یہ کہنا ہی چاہتی تھی۔

"بڑا اچھا خیال ہے۔ چلو بس اب گھر چلیں۔ واپس چلیں ——— ——— ——— ہم تینوں!"

شکارِ یزداں

(ترقی پسند ادیبوں" سے معذرت کے ساتھ)

"ایسی کوئی چیز نہیں ہو سکتی"۔ فکر نے زور دیتے ہوئے کہا اور مزید اہتمام و اتمام حجت کے لئے اُس نے بیرے کو آواز دی "ایک ایکٹ "رم" اور لاؤ!" شام کے وقت فکر "رم" ضرور پیا کرتا تھا اور سوائے کسی خاص وجہ کے ہمیشہ "نرملا کارنر" میں آکر۔ ایک عرصہ سے یہ ریستوران کناٹ پلیس کی مقبول ترین جگہ بنا ہوا تھا۔

"مگر تم بالکل غلط کہتے ہو۔ تم سر تا پا غلط ہو"۔ دلگیر نے جواب دیا۔ وہ بھی یہاں کبھی کبھی آجاتا تھا۔ یا تو اس وقت جب اس کے پاس کافی پیسے ہوں یا حسنِ اتفاق سے اس کی ملاقات فکر سے ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے تھے اور جب کبھی ان کی اچانک ملاقات ہو جاتی فکر اسے ضرور "ٹریٹ" دیا کرتا تھا۔

دلگیر نے گلاس مضبوطی سے پکڑا۔ بھاگتی ہوئی زندگی کو وہ پکڑنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ نکل جاتی تھی لیکن گلاس اُس کی مشاق شرابی انگلیوں کی گرفت سے شاید نکلنا ہی نہ چاہتا تھا اس لئے وہ اُسے

خوب مضبوطی کے ساتھ پکڑتا تھا اور شراب کا آخری قطرہ تک چوس جاتا تھا۔

گلاس میں سے چند چسکیاں لینے کے بعد اُس نے فکر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "تم بالکل غلطی پر ہو۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں زندگی کا کوئی درک ہی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تم کبھی مفلس نہیں رہے اور یکایک مشہور ہو گئے۔ عدم مقبولیت اور عسرت میں انسانی کردار کا صحیح امتحان دیکھنے میں آتا ہے۔ عُسرت اور گمنامی انسان کو رازِ ہستی سکھاتی ہے، چونکہ تم نے قدرت سے یہ دونوں چیزیں مانگ لیں اس لئے باقی نعمتوں سے تم محروم کر دئیے گئے۔ "میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو" میں اس تجربہ میں سے گذر رہا ہوں۔ یہ بات مجھ سے پوچھنے کی ہے۔ مثلاً میں تمہاری اس رائے سے بالکل متفق نہیں کہ انسان کی زندگی صرف قہقہہ ہی قہقہہ ہے۔ یا سُبکیاں ہی سُبکیاں ہیں۔ میری دانست میں تو 'ٹریجیڈی' اور 'کومیڈی'، 'آہ' اور 'واہ' دونوں ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے۔ حُزن و مسرّت دو توام بہنوں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے کا خول چہرے پر منڈھے رہتی ہیں۔"

فکر کا گلاس خالی ہو چکا تھا اور وہ عرصہ سے اس سے کھیل رہا تھا۔ دماغ کی طرف جست کرتی ہوئی شراب نے اس سے کہلوایا، "یہ بھی اپنی جگہ غلط ہے۔ حُزن زندگی کے دُکھوں کی کہانی ہے اور طرب

وہ نقل ہے جو تماشہ کے بعد دکھائی جاتی ہو، محض اس لئے کہ انسان سنجیدگی سے تنگ نہ آجائے"!

فکر ایک طباع شاعر و ادیب تھا۔ جنگی نشریات کے محکمہ میں اسے ایک بڑا عہدہ سرکاری) پروپگنڈے کے لئے مل گیا تھا۔ سرکاری ملازمت کی سب نعمتیں اُسے حاصل تھیں۔ اس کی بے لاگ تنقیدِ حیات اور سرمایہ دارانہ نظامِ عالم کے خلاف اس کی بیباک تحریریں جس نے اُسے ترقی پسند ادب میں جگہ دلائی تھی مدھم ہوچکی تھیں' چار ہندسوں والی آمدنی نے اس کا جسم موٹا اور عیش و نعمت نے اُس کی زبان طرار کردی تھی۔ جسم موٹا اور زبان طرار ہوجائے تو نگاہ دُور رس نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو صرف سطح پر سے دیکھتا تھا۔ جب سے اس نے اپنا کردار فروشی کا دھندا شروع کیا اس کو پیسے سوا ہر چیز حقیر معلوم ہوتی تھی ——!

"تم پھر غلطی پر ہو، میرے دوست"! دلگیر نے پھر زور سے کہا۔ آج سے چھ مہینہ پہلے بھی وہ اسی طرح چلّایا تھا۔ وہ ایک اخبار میں کام کرتا تھا۔ مالک نے جب اس سے ضمیر فروشی کی توقع کی تو وہ اُسے سخت سُست کہکر نکل آیا تھا۔

اخبار میں ملازمت اُس نے محض اس لئے کرلی تھی کہ وہ تقریباً بھوکا مر رہا تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اُسے معلوم ہوگیا کہ اوائلِ زندگی میں اس سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہو۔ یہ کہ اُس نے جدید تعلیم کے اس

اہم نکتہ کو نہیں سمجھا کہ انسان اپنے بٹوے اور اپنی رائے کے درمیان کس طرح دوستانہ تعلق برقرار رکھ سکتا ہے؟! اس کا اپنا یہ حال تھا کہ رائے کی بیباکی اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اس کی بے لاگ تنقید کے شور میں بٹوے کی سسکیاں وہ سنتے ہی نہ پاتا تھا۔ یہ تھا اس کے افلاس کا راز۔ وہ سوائے حقیقت کے ہر چیز کو حقیر سمجھتا تھا۔
عمر میں وہ فکر سے کم تھا۔ توانا اور پرجوش مگر زندگی سے نامطمئن۔ وہ دُنیا سے ناخوش تھا، ان چیزوں کے سبب سے نہیں جو ترس کھا کر دُنیا نے اُسے دیدی تھیں یا اس نے خود جھپٹ لی تھیں، بلکہ اِن چیزوں کے باعث جو دُنیا اُسے دے نہ سکی تھی یا دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے، جسے "رحیم" کہا جاتا ہے، اسے جو ہستی دی تھی وہ ایک ایسے کھلونے کی مانند تھی جس میں لکڑی کا بُرادہ بھرا ہوا ہو۔ اس کی ساری زندگی قدرت کے اس عطیہ کو سمجھنے میں رائیگاں ہو گئی۔ وہ اپنے وجود کو بُرادہ کا ایک ڈھیر سمجھتا تھا، اسکی ساری زندگی اُسے ٹٹولتے ہوئے گذر گئی تھی کہ شاید اس میں سے کوئی سونے کا ذرّہ دستیاب ہو جائے۔

دلگیر نے ساری "رم" ایک سانس میں چڑھالی۔ جب وہ زیادہ جوش میں ہوتا تھا تو شراب ایک دم پی جاتا تھا۔ حالتِ جوش میں وہ شراب کو آہستہ آہستہ پینا حرام سمجھتا تھا۔ وہ جوش ہی کیا جو فرو ہو جائے۔ وہ

پینا ہی کیا جو چُوسا جائے، لبوں کی طرح۔ اس آتشِ سیال کو تو پانی کی طرح پی جانا چاہیئے۔

وہ جوش میں اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے آواز کو روکتے ہوئے نیم وحشیانہ اضطراب کے ساتھ اس نے کہا: "زندگی قہقہوں اور آنسوؤں کا ایک مسلسل دائرہ ہے جس میں انسان گھرا رہتا ہے۔"

"مگر تم اس وقت نشہ میں ہو!" فکر نے مذاق کے انداز میں اعتراض کیا، لیکن اصل میں وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میں تم سے کم مدہوش ہوں۔ کم مدہوش، بدحواس شرابی کو ضرور ٹوکتا ہے۔ "تم تو ہو نشہ میں۔ تم سے بھلا کیا بحث کی جائے۔ مدہوش کا فلسفہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے "آرزوئی" کا رقص جس میں رعنائی تک نہیں ہوتی!" فکر نے دلگیر کو اسی کرسی پر بٹھاتے اور اُسے خاموش رہنے اور آہستہ نوشی کی تلقین کرتے ہوئے کہا: "ذرا آہستہ۔ لے چل کارروان کیف و مستی کو!"

مگر دلگیر بھپر گیا: "اگر تین وقت سے انسان کی غذا صرف اُسکے بھو کے تصور میں آئی ہو تو یہ لازمی بات ہے کہ "رم" اس کے معدہ میں، پردہ نشیں کی طرح، گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے عشوۂ دماغ پری بن کر اپنا جوبن دکھانے لگے۔ میں اب بھی یہی مانتا ہوں کہ زندگی صرف غم ہے۔ غم حاوی عنصرِ حیات ہے۔ میرا غم تمہارے لئے غم نہ ہو یہ دوسری بات ہے۔ لیکن غم زندگی پر مسلط ہے۔ زندگی میں قہقہہ بھی ہے۔ لیکن

زندگی کا قہقہہ تو تمسخرِ فطرت کی آواز بازگشت ہے! اصل میں طرب کا کوئی اپنا وجود نہیں. میں خود اس کا شکار ہوں. تمسخرِ فطرت کا. فطرت ہمارے ساتھ کھیلتی ہے اور جس طرح ٹریجیڈی میں ایک مسخرا آتا ہے اور دیکھنے والوں کی طبیعت کو ذرا سی دیر کے لئے محظوظ کر جاتا ہے تاکہ حزنیہ منظر کو متین و محکم ہو کر دیکھیں، اسی طرح فطرت بھی کبھی کبھار کوئی کھلونہ دکھلا کر انسان کو ذرا ہنسا دیتی ہے تاکہ آنے والے صدمہ کے لئے اس کا دل تیار رہے اور اُسے کچھ عرصہ تک برداشت کرتا رہے. بقول ٹینی سن: فطرت کا پنجۂ و منقار ہمیشہ خون آلود رہتے ہیں؛"

فکر نے رَم کے نشہ سے پیدا ہونے والی کیفیتِ برداشت سے کام لیتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی. فکر جب شراب پیتا تھا تو دُنیا پر وہ ایک روادارانہ نگاہ ڈالتا تھا. کسی سے جھگڑنا یا رنج پہونچانا اُس وقت وہ انتہائی بُرا سمجھتا تھا. اگر کسی بات پر وہ چیں بہ جبیں ہونا بھی چاہتا تھا تو اُسے شراب کے ایک گھونٹ سے دبا دیا کرتا تھا. ایک تلخی دوسری تلخی کو کاٹ دیتی ہے.

"تم یہ کیسے سمجھتے ہو کہ جو نہیں ہو وہ ہو جاتے ہو. قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی. انسان جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے" فکر نے آہستہ سے کہا.

مگر دستگیر کو ایسا معلوم ہوا کہ ریستوراں کا رنگ سبز ہو گیا ہے. صوفے، کرسیاں، پردے، دیواریں غرض ہر چیز اُسے سبز دکھائی

دے رہی تھی. غصہ کی حالت میں اُسے چاروں طرف زہر ہی زہر دکھائی دیا کرتا تھا۔

"تم پہلے میری بات تو سن لو۔ اپنی کہے جاتے ہو. اگر تم میری پوری بات سننے کے بعد ہی رائے رکھو تب کہنا. میں تو اپنی ذاتی مثال ثبوت میں پیش کر رہا ہوں۔" کہتے ہوئے دلگیر نے فکر کی برف جیسی سفید قمیص کو اپنی انگلیوں سے جو سیاہی کے دھبوں سے غلیظ ہو رہی تھیں چھوتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا تفصیل کے ساتھ اپنی کہانی سُنانا چاہتا ہوں. غیر ضروری تفصیل کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں. اس کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں دہلی آیا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ تعلیم ختم کرکے یہ سوچا کہ ادب کو معاش کے طور پر اختیار کروں. صحافی ذمہ داریوں سے میں پہلے ہی آگاہ تھا لیکن یہ دیکھکر کس قدر دُکھ ہوتا تھا کہ آرٹ اور ادب ابھی تک فرسودہ غیر ترقی پسند روشوں پر جا رہا ہے۔ ادب میں تنقید نام کو نہیں ہے اور جو ہے وہ بد دیانتی پر مبنی ہے. میرا ارادہ دہلی آنے سے یہ تھا کہ لوگوں کو بتاؤں کہ ادب کو زندگی سے کس طرح قریب تر لایا جاسکتا ہے اور وقت کی پکار کیا ہے. میں صحافت کے ذریعہ ترقی پسندانہ خیالات نشر کرنا چاہتا تھا۔"

"چنانچہ میں دو سال تک یہاں رہا۔ لیکن تجربہ نے مجھے بتایا کہ ادب میں بہت کچھ اصلاح کی گنجائش ہے۔ زندگی پر دیانت دارانہ

تنقید کی ضرورت ہے اور یہ بے لاگ تبصرہ ادب ہی اُسے ترقی پسندراہ پر لا سکتا ہے۔ لیکن ادب میں آکر میں نے ایک سبق سیکھا کہ اگر انسان اپنی ایک بیش بہا قیمت دُنیا سے وصول کرنا چاہتا ہے تو مکاری سے کام لے۔ ترقی پسندی کا نام لیتا رہے مگر رجعت پسندانہ کام کرتا رہے لیکن حق اور دیانت کو خوبصورتی کے ساتھ چھپاتا رہے۔ میں نے جب ترقی پسند ادیبوں کا یہ رنگ دیکھا تو خود بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ میں نے ادب پر پُرخلوص تنقید شروع کی۔ ہندوستان کے رسالوں اور اخباروں میں خوب ڈھول پیٹا۔ فلم میرا محبوب مشغلہ تھا۔ اس پر بھی تنقید لکھنی شروع کی۔ مگر میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی تبصرہ حقیقت پر مبنی نہیں لکھوں گا۔ خلوصِ قلب اور بیباکی رائے کو نہ عوام پسند کرتے ہیں نہ خواص۔ آخر اس گرم بازاری سے کیا حاصل جس میں جیب قلم کا مُنہ تکتے تکتے "جاں بحق" ہو جائے۔ لوگ جھوٹی تعریف اور مصنوعی زندگی سے اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ پُرخلوص بات کو جلن اور حسد کہکر اپنی راہ لگتے ہیں۔ میرا کمال یہی تھا کہ اپنی ترقی پسند تحریروں سے لوگوں کو کامیابی کے ساتھ تاریکی میں رکھ سکوں۔

ایک دن میں اپنے فلیٹ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک دماغ میں یہ خیال آیا کہ بددیانتی سے کیا حاصل ہے۔ کوئی نیک عمل کرنا چاہیئے۔ ضمیر کی آواز سننا ایسا ہی ہے جیسے جاڑوں کی دوپہر کو پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ٹھنڈا گلاس پینا۔ پیاس تو بیشک بجھ جاتی ہے مگر

بعد میں پھیکی کس قدر لگتی ہے۔ ایسا ہی ضمیر کی آواز سنتا ہے۔ اسکے کہنے پر عمل کرو تو اس دنیا میں عسرت کی خنکی تمہارے جسم کو جھنجوڑ کر رکھ دے گی۔ اس رات میں نے ایک پبلشر کی فرمائش سے اختر عباسی کی کتاب "ساحلِ رباط کا ساحر" پر تبصرہ لکھا اور اس ڈرامہ کی بہترین تعریف جو ممکن ہو سکتی تھی لکھی۔ کیونکہ پبلشر نے اور مصنف نے مل کر میری خوشامد کی تھی۔ میری تنقید چھپنے سے ملک میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس ڈرامہ پر میری تنقید نکلی تھی کہ دنیائے ادب میں ایک شور برپا ہو گیا۔ لوگ جس ادبی امام مہدی کی راہ دیکھ رہے تھے وہ پیدا ہو گیا تھا۔ میری "بے لاگ" تنقید کو سب نے سراہا۔ ہر شخص مجھ سے مطمئن تھا۔ مصنف خوش تھا۔ مصنف کا خدا یعنی پبلشر خوش تھا۔ ضمیر ملول تھا، تو اس کی بات سننا میں نے عرصہ سے چھوڑ دیا تھا۔

اس تبصرہ کے چھپنے کے بعد ایک روز میں اپنے فلیٹ کے برآمدہ میں بیٹھا تھا اور اپنی زندگی پر غور کر رہا تھا کہ ضمیر نے میرے دل کے دروازہ پر آکر دستک دی۔ دماغ کے حاجب نے اُسے روکنا چاہا مگر میری اس ہستی سے پرانی ملاقات تھی اس لئے اُسے اندر بلا لیا۔ اس کی حجتیں سنتا رہا۔ میں اپنی دنیا بنا رہا تھا، اس کی اصلیت اب محسوس ہوئی۔ دل رونا چاہتا تھا مگر دماغ نے اُسے ڈانٹ دیا۔ سامنے پڑے ہوئے بٹوے نے میری تائید کی ——

ان سب کی تکرار سُنکر میں زندگی کی اس ٹریجیڈی پر کھلکھلا کر ہنس پڑا ــــ!

اس کے بعد، فکر، مَیں اور بھی تندخو ہو گیا۔ افسانہ نویسوں کے افسانوں کے نقص نکالنا، شعرا کے کلام کی عیب جوئی اور رجعت پسندانہ تحریروں کو ترقی پسند ادب کہہ کر پبلک کے سامنے لانا میرا اہم کام ہو گیا۔ دولت اور شہرت میں بہنے لگا۔ فلم ایکٹریسوں کی تعریفیں لکھنا اور اُن سے پیسے وصول کرنا بھی میرے کام کا جُزو تھا۔ غرض ایک دُنیا کو مَیں بیوقوف بنائے جا رہا تھا۔ دن رات قلم گھِستا رہتا تھا۔ قلم لکھتا۔ ضمیر روتا۔ اور دماغ ہنسے جاتا تھا۔

لوگ میری بددیانتی اور مکّاری کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ جھوٹ کو چھپانے کے لئے سلیقہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ برتنا میں جانتا تھا۔ میں جس مشاعرہ یا ادبی صحبت میں پہونچ جاتا تھا، لوگ کہتے تھے "یہ ہیں شاعرِ انقلاب دلگیر"۔ چنانچہ میں خود بھی یہ سوچنے لگا تھا کہ میں "کچھ ہوں"۔ مکّاری اب میرا خمیر بن گئی تھی۔ میں نے ایک ادبی تقریر میں کہا کہ لوگ میرے آرٹ کی بہت نقل کرتے ہیں، میرے لب و لہجہ کی نقل کرتے ہیں، میرے فرنیچر کی ناپ لے جاتے ہیں۔ ادیب اور افسانہ نگار میرے پاس مدد مانگنے آتے ہیں اور میں باوجود اپنی کم فرصتی کے اُن کی مدد کرتا ہوں۔ اس قسم کی باتیں کرنے سے لوگ قدر کرنے پر مجبور ہو جاتے

ہیں ـــــ

لیکن میں جو قصّہ سُنانا چاہتا ہوں وہ تو اور ہی کچھ ہے۔ خیر۔ اچھا۔ سُنیئے!۔

میں جس وقت کا قصّہ سُنانا چاہتا ہوں اُسے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ برسات کے دن تھے کہ میں تسخیرِ فطرت کا شکار بنا۔ جی ہاں! ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کیا بس ایک شعلۂ جوالہ تھی' ایک احتراقِ حریری۔ میں سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ بارش ابھی تھمی تھی اور پھر برسنے کیلئے تُلی کھڑی تھی۔ یہ لڑکی میرے آگے آگے چل رہی تھی اور باقی سڑک سُنسان تھی۔ آپ نے وہ سڑک ضرور دیکھی ہوگی جو چیف کمشنر کی کوٹھی سے سیدھی کشمیری دروازہ تک آئی ہے۔ یکایک بارش پھر شروع ہوگئی۔ طوفان سا آرہا تھا میں بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لینے کیلئے کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی اسی درخت کے نیچے آگئی کیونکہ اس سے زیادہ گھنا درخت نزدیک اور کوئی نہ تھا۔ عورت کی چال میں ایک نغمیات ہوتی ہے جس سے آپ عورت کو "پڑھ" سکتے ہیں۔ لیکن خیر میں اس بحث کو اور کسی وقت کیلئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

ساری سڑک اور اردگرد کا سارا منظر سُنسان تھا۔ صرف دو روحیں اس درخت کے نیچے کھڑی تھیں جیسے "نیو تھیٹرز" کے فلم میں دو پرند طوفانی رات کو کسی درخت کی بھیانک شاخ پر دکھائے جاتے ہیں، بہت دیر تک دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ آسمان

پر بجلی چمکی، مجھے شوخی سوجھی. خواہ مخواہ ایک سرد آہ کھینچی جس نے لڑکی کو میری طرف متوجہ کر دیا. چند لمحہ بعد میں نے پھر ایک آہ کھینچی. اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی. قسم ہے وہ کیا ہنسی تھی. اُف! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سال کے تینوں موسموں کی رعنائیاں کھنچکر اس میں آگئی ہیں!.

میں نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا. اس سے پہلے بہت سی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں مگر ایسی بات کسی میں نہ تھی. اس کی آنکھوں میں شدت غم کا ایک سیلاب سا مجھے دکھائی دیا. ایک طلسمی چمک جو کبھی پیدا ہوتی تھی اور کبھی ازخود مدھم پڑ جاتی تھی.

مجھے اس سے بولنا پڑا. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نامعلوم ہاتھ نے مجھے پکڑ کر اس کے اور قریب پہونچا دیا. میں نے ہمت کر کے کہا "آپ ہنس رہی ہیں؟" یہ کہکر میں نے اس کی طرف دیکھا اور اُس نے میری طرف. اسکی آنکھیں ایک گہرے سوز سے غمگین دکھائی دیتی تھیں. نہ جانے کیوں میں مگر وہ آنکھیں دیکھ کر مسکرایا. دل میں سوچا آج فطرت پھر میرے ساتھ کوئی تمسخر کرنا چاہتی ہے. فطرت کے ہاتھوں میں میں کب تک کھلونا بنا رہونگا.

بارش تھم گئی. میرے کہنے سے وہ میرے ساتھ ساتھ سڑک پر چلنے لگی اور کچھ باتیں بھی شروع ہوئیں. اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ طیور

آوارہ میں سے ہے جو فلم کے ذوق میں پر شکستہ ہوکر اب نشیمن کی پروا کئے بغیر ایک تصوّری زندگی گذار رہی ہے۔ اس کے خیالات ترقی پسندانہ تھے۔ فلم سے دلی اُنسیت تھی، اور چاہتی تھی کہ ساری زندگی "صنوبر کے سایوں" میں گذار دے۔ لیے ترقی پسندی نے یہ سکھایا تھا کہ کسی ایک درخت کے سایہ میں زندگی بسر کرنا بے سود ہے، طائرِ ترقی کو بوئے گُل کی طرح پریشان صورت اور پریشان حال رہنا چاہیئے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اُردو کے ایک مشہور ادیب نے اُسے ترقی پسندی کے "عملی معنی" سکھلائے تھے۔ جب اس کی بدنامی ہوئی تو وہ علیگڑھ چھوڑ کو بمبئی چلی گئی اور وہاں کی آب ہوا نا موافق دیکھکر پھر شہر در شہر پھرتی رہی۔ آج کل وہ دہلی میں "پریکٹس" کرتی ہے!۔

غرض اس طرح میری اور اس کی راہ ورسم بڑھ گئی۔ میں نے لُسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا، اُسے اپنا جزو بنالیا۔ مرد عورت کو فوراً اپنی زندگی کا جزو بنالیتا ہے مگر عورت مدت العمر میں بھی مرد سے بدگمانی نہیں چھوڑتی۔

میں اور وہ ایک فلسٹ میں رہنے لگے۔ لیکن مَیں اُس کی زندگی کی تہ کو نہ پہونچ سکا۔ وہ مجھ سے کچھ الگ الگ رہتی تھی، مگر ظاہر نہ ہونے دیتی تھی مَیں ایک سُست طبیعت آدمی تھا اور وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میری انفرادیت مکمّل نہ ہو سکی اور وہ مجھے اپنا مقصودِ زندگی نہ بنا سکی۔
اس لڑکی کا اپنا ایک فلسفۂ زندگی تھا۔ زندگی سے مطمئن جاہل اور

زندگی سے بے اطمینان عالم کا جو فلسفۂ زندگی ہوتا ہے وہ اس لڑکی کا تھا۔ وہ مجھ سے یہ بھی کہا کرتی تھی کہ انسان کو ہستی اس لئے ملی ہے کہ اسے آخر میں رو رو کر اور مر مر کر ختم کر دے۔ یہ کہکر وہ میری طرف دیکھکر مسکرانے لگتی اور "چل چل رے نوجوان" کہکر کمرہ میں ناچنے لگتی۔

اس وقت بھی میرا یہ خیال تھا اور اب بھی یہ خیال ہے کہ زندگی پریوں کی کہانی نہیں ہے، حقیقت میں "چراغ علاء الدین" اور "ابوالحسن" کہیں نہیں دکھائی دیتے۔

ایک روز وہ میرے پاس آئی۔ میں اپنے کمرے میں، جسے میں دفتر کہا کرتا تھا، بیٹھا ہوا ایک مضمون لکھ رہا تھا، ایک ترقی پسند افسانہ، جسے پڑھ کر لوگ دنگ رہ جائیں۔ اور کچھ مطلب نہ سمجھ کر یہ فیصلہ کریں کہ ضرور یہ "آرٹ" ہے!۔

اس وقت وہ ایک معمولی "پیٹی کوٹ" میں بستر سے اُٹھکر چلی آئی تھی۔ اُوپر سے ایک ہلکی شال ڈال لی تھی۔ عُریانی ادیبوں کی ترقی پسندی کا حلف نامہ ہے جس کے بغیر ان کی ترقی پسندی مسموع ہی نہیں ہوتی صبح کے وقت وہ کوئی لباس نہ پہنتی تھی۔ "پیٹی کوٹ" اور "انڈیز" کے اُوپر بس ایک چادر ڈال لی اور بستر سے چل پڑی۔ میرے احتجاج کرنے پر وہ کہتی کہ "سارا دن تو تکلف ہی میں گذر جاتا ہے۔ یہ دن ہے، یہ دوپہر ہے، یہ شام ہے، یہ رات ہے، صرف صبح کے چند گھنٹے ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے جامے میں ہو سکتا ہے، ورنہ باقی دن تو دوسروں کیلئے

کپڑے پہنتا ہے!"

یہ کہکر وہ میرا پیار لے لیتی اور مَیں جز بز ہو کر رہ جاتا۔ جھنجلا جاتا اُس کی اس حرکت پر مگر آخر کار اُسے معاف کر دیتا۔ آدمی اپنی زندگی کا بڑا حصّہ اپنے پیاروں کو معاف کرنے میں گذار دیتا ہے۔ "دلگیر!" کہہ کر وہ اُچکتی اور میری میز پر آ جمتی۔ آج بھی وہ آ جمی۔ اب میرا لکھنا قطعی ناممکن ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے ننگے پیر دیکھ کر کہا کہ ابھی بھاگ جاؤ اور سلیپر پہن کر آؤ۔ چنانچہ وہ روز کی طرح آج بھی دوڑی اور آج بھی اس کے پیر میں ایک خیالی سُوئی چُبھ گئی۔ بچوں کی طرح روتی بسورتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے اس کا تلوا سہلایا اور آہستہ سے اُسے چُوم لیا۔

اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ آج بھی ہوا۔ پوچھنے لگی "آج کیا زندگی کی حقیقتیں لکھی گئی ہیں؟ میں بھی تو سُنوں"۔

میں نے اُسے ٹال دیا۔

پیارے فکر، عورت کے دماغ کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ تُند ہوا میں جُھومتے ہوئے لالۂ خودرو کو جس طرح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میرا رُخ کدھر ہو جائے گا اسی طرح عورت کے دماغ کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس طرف جُھکے گا۔ مگر یکایک وہ کوہِ گراں یا قدامت پسند پارٹی کے خیالات، کی طرح سخت اور جامد ہو جاتے ہیں۔ پھر ترغیب، تحریص، اور تہدید یا بلیغ ترین منطق بھی اُسے نہیں روک سکتی۔

وہ کہنے لگی: "میں بھی تو دیکھوں کہ زندگی کی کیا ترقی پسندانہ حقیقتیں

ہیں جو آپ لکھ رہے ہیں۔ دیکھوں کہ سچ ہیں یا جھوٹ "

اس پر میں نے جواب دیا کہ "میں وہ جھوٹ لکھ رہا ہوں جسے لوگ سچ سمجھتے ہیں۔ میری ساری زندگی بناوٹی ہے اور یہ محض دکھانے کیلئے ہے کہ لوگ کہہ سکیں کہ میں بھی ایک ترقی پسند ادیب ہوں اور مزدور کی طرح محنت کر کے اپنا رزق پیدا کر رہا ہوں "

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ مجھے یاد دلانا چاہتی تھی کہ سرکاری پروپگنڈے کی آمدنی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ دو چار نظمیں اگر اس نوعیت کی بھی لکھ دیں تو کیا ہے۔

وہ کہنے لگی "تم سچ کہتے ہوئے کیوں ڈرتے ہو۔ سچ سچ ہی ہے۔ سچ لکھنے میں کیا تامل ہے۔ رائے کو بیباکی سے ظاہر کرنے میں مصلحتیں کیوں حجاب بنتی ہیں؟"

میں نے ہنس کر پوچھا "اگر میں واقعی حق گو ہو جاؤں تو کیا پھر تم مطمئن ہو جاؤ گی مجھ سے؟"

"یقیناً! مجھے صرف حقیقت سے محبت ہے اور تم حقیقت نگاری سے گریز کرو گے تو تمہیں بھی معمولی ادیب سمجھوں گی" یہ کہہ کر وہ میز پر سے اُتر پڑی۔

میں نے اُسے جواب دیا "اچھا تو پھر آج سے عہد ہے کہ صرف حقائق پر ہی بحث کروں گا۔ بددیانتی کو شعر و ادب سے نیست و نابود کرنا میری زندگی کا مشن رہیگا"

وہ کپڑے پہننے اندر چلی گئی۔ میں نے ایک تنقید لکھی تھی اُسے پڑھا۔ یہ ایک ڈرامہ تھا مسٹر اختر زندانی کا لکھا ہوا۔ پہلے اس کی تعریف اور قصیدہ نما تعریف لکھی تھی۔ اب اس پر باقاعدہ جرح کر کے لکھنا شروع کیا۔ اس ڈرامہ کا نام تھا ــ "ظاہر داریاں" ــ اس کا غیر فطری پلاٹ جھوٹے اور مضحکہ خیز مناظر اور اخلاق سوز سبق، جو اس ڈرامہ سے قاری کو ملتا تھا، میری جرح کی زد میں آئے۔

لکھتے لکھتے مجھے خیال آیا "وہ مجھ پر اعتماد کرتی ہے اس اعتماد کو برقرار رکھنا ہوگا" میں نے دل میں سوچا کہ ساری عمر جس چیز کی تلاش میں گذری تھی وہ یہ اعتماد تھا۔ اگر ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو خدا تک کیسے پہونچیں۔ خدا سے نزدیک تر لانے کے لئے ہمیں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

دوسرے روز رسالہ "صبوحی" میں میرا یہ مضمون نکلا۔ نکلنے کے بعد ایڈیٹر نے مجھے بلایا اور اس سے میرا جھگڑا ہوگیا۔ کہنے لگا کہ "پندرہ سال سے میں یہ رسالہ نکال رہا ہوں لیکن اس سے زیادہ خرافاتی چیز پہلے میں نے کبھی نہیں چھاپی تھی۔ کیا پاگل ہوگئے تھے یا نشہ میں تھے؟"

میں نے جواب دیا "حضرت آج سے میں صرف دیانت دارانہ تنقید ہی لکھا کروں گا۔ اب میرا مشن یہی ہے۔ جدید شاعری کے فنی معائب پر جرح اور چند ادبی بتوں کو توڑنا میرا فرض ہوگا۔ میں ان بتوں کے آگے سجدہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔"

"سنو میاں صاحبزادے!" وہ ایڈیٹر کہنے لگا۔ "تم محض ایک نقادِ حیات ہو مصلح یا واعظ نہیں۔ اگر تم وہ نہیں لکھ سکتے جو پبلک چاہتی ہو تو آج سے ہمارا رسالہ تمہاری تحریروں کیلئے بند ہے۔"

میں نے اس سے زیادہ بحث نہیں کی کیونکہ اس سے بہت پہلے یہ تجربہ مجھے ہو چکا تھا کہ بے رائے اور بے خیال ایڈیٹروں سے حجتِ حکمت کی بات کرنا اندھے کو یہ یقین دلانا ہے کہ تُو دیکھ سکتا ہے۔

میں اس پر بپھر گیا: "بھاڑ میں جائے تمہاری پبلک، تمہارا رسالہ اور تمہارے یہ جھوٹ اور یہ ترقی پسند ادب! یہ ادب ہے یا ہفوات نگاری۔ ادب تو ادب ہے!" یہ کہکر میں اس کے دفتر سے چلا آیا۔

میں رسالوں میں کوئی ترقی پسند افسانہ لیکر جاتا تو ایڈیٹر یہ کہتے کہ اس میں زندگی کی بھیانک تاریکیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ میں مطلب پوچھتا تو وہ بتاتے کہ شرمناک امراض، گھناؤنے طریقہ ہائے جنسی اور دیگر امور کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ میں حیران و ششدر رہ جاتا کہ جب ہم نے ترقی پسند ادب کا نعرہ بلند کیا تھا تو کیا ذہن میں ایسے ہی مکروہات ادب تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میرا بازارِ ادب سرد پڑ گیا۔ ہم جس فلیٹ میں رہتے تھے وہ چھوڑنا پڑا اور ایک معمولی سا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ زندگی کی پُخت و ریخت ازسرِ نو شروع ہوئی۔ اب مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ عسرت کی خنکی آہستہ آہستہ میری پیٹھ میں سرایت کر رہی ہے اور اسے گرمی

سے بدلنے کے سئے اس لڑکی کے آغوش میں بھی حرارت باقی نہیں رہی ہے کیونکہ وہ اب مجھے محبت سے نہیں چمٹاتی بلکہ آنے والے بھیانک مستقبل سے ڈر کر چمٹتی ہے. ہم نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے سے تھک چکے ہیں اس کا مجھ پر اعتماد کم ہو گیا ہے بلکہ وہ مجھ سے الگ الگ رہنے لگی ہے. میں افلاس میں اور وہ اغماز میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے.

لوگ اب میری طرف دیکھ کر تپاک و توقیر سے اشارہ نہیں کرتے تھے بلکہ تحقیر و تاسف سے انگلیاں اٹھاتے تھے. رحم و تاسف بھی کس قدر شیریں چیز ہے. مگر مجھے تو یہ رحم و تاسف ایک بھوکے فاقہ کش کی قبر پر لگے ہوئے لوح مزار کی مانند معلوم ہوتا تھا اوپر سے کیسا چکنا اور چمکدار مگر باطن میں کتنا سخت اور سرد!

آج سے دو مہینہ قبل ایک شخص نے مجھ سے کسی فلم کمپنی میں جانے کے لئے ایک تعارفی خط مانگا تھا. راستہ میں ایک دن وہ مجھے پھر ملا. مگر وہ مجھے پہچان نہ سکا. دیکھ کر پوچھنے لگا: "معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچانا نہیں." میں نے جل کر کہا: "ارے بھئی میں ہوں. یعنی تم نے میرا نام........"

میں نے اپنا نام بتایا. کہنے لگا: "سوچتا ہوں. دلگیر! دلگیر! ہاں کچھ یاد آتا ہے مگر آپ ــــ خیر فرمائیے کیا حکم ہے!"

میں بس اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ لوگ مجھے بھول گئے نہ!

میری قدر کم ہو گئی۔ کیونکہ اب دوا فروشوں کی طرح اشتہار دینے
والے ادیب اُفقِ اُردو پر نمودار ہو چکے تھے۔ گیتی ادب کو کیا ضرورت
پڑی تھی کہ مجھ جیسے ڈوبتے ہوئے تاروں کا ماتم کرتی۔

تو فکر تم نے غور کیا کہ یہ سانحہ کس قدر جانکاہ تھا میرے لئے۔
لوگ اب میرے نام تک کو بھول گئے تھے۔ آپ ترقی پسند ادیبوں کے
سرتاج ہیں اور نقاد فسانہ نگار ہیں' آپ ہی اس کا صحیح اندازہ لگا سکتے
ہیں کہ ایسے عالم میں کسی پر کیا گذر سکتی ہے۔

اور پھر یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ میں جو اس قدر
ناکام طریقہ پر حق پرست ہوں آج یہ بات آپ سے کہہ رہا ہوں جو
اس قدر کامیابی کے ساتھ جھوٹا ہے! معاف کرنا اس تلخ نوائی کو۔
مگر ہم دونوں احمق ہیں' اور کیوں ہیں یہی میں بتانا چاہتا ہوں"

مگر خیر میں قصہ آگے بیان کرتا ہوں۔ ایک دفعہ رات کو میں بہت
دیر سے گھر واپس آیا۔ تھک کر چُور ہو گیا تھا۔ جب آدمی تھکا ہوا ہو تو
دماغ ایک زندہ چیز بن جاتا ہے۔ جو جسمانی تکان اور دکھ سے علیحدہ
ہو کر پورے خروش اور آزادی کے ساتھ دُنیا کی ہر چیز سے جھگڑنے پر
آمادہ رہتا ہے۔

رات اندھیری تھی اور بادل چھائے ہوئے تھے۔ سخت اندھیرا
تھا۔ مجھے اپنے ارد گرد کی ساری دُنیا ایسی تاریک معلوم ہو رہی تھی جیسے
اگر سین کی باڈلی میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی آنکھوں کے سامنے کالی روشنائی

کا ایک جانگاہ سمندر دکھائی دیتا ہے۔

میں نے کمرہ کھولا اور اُسے آواز دی۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دیا سلائی روشن کر کے لالٹین کے قریب پہونچا۔ اُسے روشن کر کے چاروں طرف دیکھا۔ ترقی پسند ادیبہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میز پر ایک پرچہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ "میں ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس سے جا رہی ہوں۔ میرے معتقدات تمہارے خیالات سے متفق ہوتے نہیں دکھائی دیتے۔ شاید تم یہ کہو گے کہ حقیقی زندگی میں کوئی عورت ایسا نہیں کر سکتی مگر میں ایسا کر کے دکھاؤں گی۔ تم نے "ظاہر داریاں" ڈرامہ پڑھا ہے۔ اس کے تیسرے ایکٹ میں بھی ایک ایسی کیفیت مصنّف نے لکھی ہے جسے آپ نے اپنی تنقید میں زندگی سے بعید بتایا ہے۔ کیا حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا؟ ضرور ہوتا ہے۔ مگر آپ نے محض اعتراض کرنے کی خاطر اعتراض کرتے ہوئے مصنّف پر جرح کی ہے کیونکہ اس کا قصور غالباً صرف اتنا ہے کہ وہ آپ کے صوبے کا باشندہ نہیں ہے۔ میں اس چیز کو بد دیانتی سمجھتی ہوں۔ تم نے لالچ یا مروّت میں آکر کسی کے کہنے سے یا اپنے جغرافیائی تعصب کی بنا پر ایسا کیا ہے۔ مگر ایسا ہونا خلافِ حقیقت نہیں ہے۔ میں خود اس پر عمل کر کے دکھاتی ہوں۔ شاید یہ پڑھ کر تم ہنسو گے مگر زندگی ایسی ہی جھوٹی حقیقتوں کا نام ہے!"۔

میں نے غصہ میں آکر یہ کاغذ پھاڑ دیا اور اسے فرش پر پھینک دیا۔ مگر پھر کچھ خیال آیا۔ جھک کر تمام پُرزوں کو چُن لیا اور انہیں چُوم لیا پھر چُوما۔ بار بار چُومتا ہی رہا۔

اس طیش و اضطرار کی حالت میں مجھے یہ بات یاد تھی کہ "ظاہر دار بیگ" ڈرامہ میں بھی ہیرو اسی طرح خط پھاڑتا ہے مگر میں نے اسے خلافِ حقیقت لکھا تھا۔ اس کے پلاٹ کو غیر ممکن الوقوع بتایا تھا۔ سارے ڈرامے کو غیر دلچسپ اور بے تُکے پن سے تعبیر کیا تھا۔

میں ایک کرسی سے ٹکرایا۔ میرے متصورہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی نیم تاریک گوشہ میں کھڑی ہے اور اس کی مُردہ آنکھوں میں ایک عجیب آگ سی روشن ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کا قہقہہ جس میں سال کے تینوں موسموں کی رعنائیاں سمٹی ہوئی محسوس ہوا کرتی تھیں جو پہلے پہلے میں نے ایک سڑک کے کنارے کسی درخت کے نیچے سُنا تھا۔ یہ قہقہہ مجھے بار بار سنائی دے رہا تھا مگر مجھے یہ بھی محسوس ہونا شروع ہوا کہ یہ میرے ہی قہقہہ کی گونج ہے۔ ایک طرف مجھے اپنے کانوں میں اس کا قہقہہ سنائی دے رہا تھا اور دوسری طرف اپنا قہقہہ۔ اس کے قہقہہ کی آواز میرے متخیلہ میں آنے سے باز نہیں آتی تھی اور اپنے قہقہہ کی آواز کو اپنے کانوں میں آنے سے روک نہ سکتا تھا!

اس کشمکش نے مجھے دیوانہ سا کر دیا۔ اس سے پہلے میں نے یہ

محسوس نہیں کیا تھا کہ اس لڑکی کو میری زندگی میں اتنا گہرا دخل حاصل ہو چکا ہے۔ اس کی ہستی میرے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ میں سر پکڑے بیٹھا رہا معلوم نہیں کہ کس قدر وقت گذر گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کئی ہفتے گذر گئے ہیں۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اب اس کے نازک پیروں کی نرم آواز کسی گوشہ سے نہیں آئے گی۔ اب وہ مُسکرا کر میرے گلے میں باہیں نہیں ڈالے گی۔ بس اسکے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ معلوم ہوا کہ برآمدہ کے آہنی ستون سے ٹکرا کر میں بے ہوش ہو چکا تھا کہ پڑوسیوں کی مدد سے مجھے ہسپتال پہونچایا گیا۔

ہسپتال سے آنے کے بعد میری زندگی ویسی ہی سُنسان اور تاریک رہی۔ اندھے کنوئیں کی مانند تاریک اور خُشک مگر بہت گہری۔ آپ کو بھلا کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں کس دوزخ میں ہوں۔ آپ کو کیا معلوم ہے کہ مَیں کس جہنّم میں سے گذرتا ہوا یہاں تک پہونچا ہوں۔ لیکن خیر زندگی جنّت ہو یا جہنّم حقیقت نگار ادیب کو ہر وقت ہنسنا ہی پڑتا ہے، چنانچہ میں بھی ہنستا ہی رہا۔ کیونکہ مجھے رونا بھی آتا تھا تو دماغ اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔

ابھی چند روز کی بات ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی کہانی ایک ڈرامہ کی صورت میں قلمبند کی ہے۔ ایک عرصہ تک اُسے لئے لئے پھرا لیکن کوئی ایسا نہ ملا کہ اس پر ایک نظرِ تنقید ڈال سکتا۔ آخر کار مَیں نے

ہمت کرکے یہ ڈرامہ سید ممتاز علی کے پاس بھیج دیا۔ میں سیّد صاحب کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ ڈرامہ نویسوں میں اپنی تحریر کے بارے میں جس قدر بیقراری ہوا کرتی ہے اور جس کا میں مذاق اڑایا کرتا تھا آج خود میں اس جذبہ کا شکار ہو رہا تھا۔ جب انسان بھوکا ہو تو اس میں شاید ہی کوئی جذبہ زندہ رہتا ہے۔ بھوک تمام محسوسات کو خود کھا جاتی ہے اس وقت انسان کو بھوک کی عظمت و جبروت ایک ضرب کی مانند معدہ میں محسوس ہوتی ہے، تب اُسے احساس ہوتا ہے کہ بھوکے غیر شائستہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ یہ اضطرار کیوں قابلِ عفو سمجھا جانا چاہیئے۔ بہرکیف، مختصر یہ کہ مجھے معلوم تھا کہ سید ممتاز علی مجھے کیا جواب دینگے چنانچہ اُن کا ایک حکم مجھے ملا کہ مجھ سے آکر ملو۔ میں اُن کے پاس گیا۔ کہنے لگے "ڈرامہ بہت اچھا لکھا گیا ہے" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ میری طرف بہت تجسّس کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کہکر انہوں نے دراز کھول کر میرا مسودہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے دراصل کیا کیا ہے؟"

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس لئے خود ہی جواب دیا "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے "ظاہر داریاں" ڈرامہ کی پوری کہانی اس میں نقل کر دی ہے۔ جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے خود اپنی زندگی کی کہانی لکھی ہے!"

سیّد صاحب نے میری بات کا ایک قہقہہ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

جیسے کوئی خدا آسمان پر بیٹھ کر مجبور و ناچار بندوں کی بے بسی پر طنز کر رہا ہو۔؟

فکر نے گہری دلچسپی کو قائم رکھنے کے لئے ایک ایک رم اور منگائی۔ دلگیر بولے جا رہا تھا۔

"میں یہ قصّہ آپ کو کیوں سُنا رہا ہوں اس کی کوئی وجہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر خیر سنیئے۔ آج میں نے اس تمام عرصہ کے بعد پھر ایک بار دیکھا۔ آج صبح۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میں تمہاری پیش کردہ شراب برابر پیئے جا رہا ہوں۔ دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کر پینے والے جگر کی کی مانند میں بھی پیئے جا رہا ہوں۔ دراصل میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں سخت احمق ہیں۔

میں نے اسے کس طرح دیکھا؟ اس طرح دیکھا کہ بس دیکھ لیا۔ ایک جگہ وہ کھڑی ہوئی تھی۔ کسی نے میری توجّہ اس کی طرف مبذول کرائی۔ فالتو بات کرنے والے اکثر نہایت اہم چیز کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

ایک آدمی کہنے لگا: جانتے ہو ان صاحبزادی کو معلوم نہیں کہ یہ کون ہے مگر آج کل بےحد مقبول و معروف ہے۔ ترقی پسند ادیبہ ہے۔ اور اُردو کے سب سے بڑے نقاد ترقی پسند ادیب کی بیوی ہے جو ایک بہت بڑے سرکاری عہدہ پر فائز ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ مگر چہرے سے وہ تازگی جاتی رہی تھی جو عمر کا خاصہ ہوتا

سے ہے. میں نے اُس کی آنکھیں دیکھیں. وہ مجھے پہچان نہ سکی. پہچان بھی نہ سکتی تھی. لیکن ان مُردہ آنکھوں میں نہ جانے کیوں ایک قسم کی حرارت سی چمکتی ہوئی دکھائی دی. میں نے دیکھا کہ وہ کسی نامعلوم خیال سے کپکپانے لگی اور اپنے قیمتی فرکوٹ میں چھپی چھپائی گذر گئی.

میں اس سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا. بس جی یہ چاہا کہ اپنی جان اس کے قدموں پر رکھ دوں. مگر میں کچھ نہ کر سکا. چشم زدن میں وہ نکل گئی. میں کھڑا ہنستا رہا. اس کے بعد سارا دن خیالات کے جاسوسوں سے کھیلتا رہا. شام ہوئی تو یہاں آیا اور اس وقت آپ کے ساتھ شراب پی رہا ہوں. آپ جو ہندوستان کے سب سے بڑے اور امیر ترقی پسند شاعر و ادیب ہیں، میں کہ چونکہ سب سے زیادہ غریب ادیب ہوں اس لئے کسقدر غیر ترقی پسند سمجھا جاتا ہوں."

دلگیر کی گفتگو یہاں آکر ذرا رُکی. فکر بہت گہری دلچسپی کیساتھ اس کا منہ تک رہا تھا. کہنے لگا "میں نے "ظاہر داریاں" پڑھا ہے. لیکن اس وقت خیال نہیں، اور نہ یہ معلوم ہے کہ آپ نے جو اپنی زندگی کی کہانی ایک ڈرامہ کی صورت میں لکھی ہے، اس کا انجام کیا ہوا. دونوں ڈراموں کا چوتھا ایکٹ کس طرح ختم ہوا؟"

دلگیر کو کرسیاں، صوفے، پردے، در و دیوار پھر سبز دکھائی دینے لگے. طنز کا زہر پھر اس کے دماغ میں پیدا ہو رہا تھا. فکر کو اس نے جواب دیا "انجام بہت معمولی سا ہوا. وہی فرسودہ طریقہ اس قسم

کے ڈراموں کے ختم کرنے کا۔ یعنی یہ کہ ہیرو اس شخص پر جس سے اس کی ہیروئن کی شادی ہوئی ہے یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ لڑکی پہلے میرے تصرفِ عشق میں تھی۔ اس سے ایک نوع کا "میلوڈرامہ" پیدا ہو جاتا ہے اور افسانے کے سب کردار اپنی اپنی جگہ پست و ملول ہو جاتے ہیں۔ میں اس قسم کے انجام سے نفرت کیا کرتا تھا اور دوسروں کے ڈراموں میں اس عیب کو پا کر سخت تنقید کیا کرتا تھا کہ یہ کس قدر غیر فطری انجام ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر میں کس قدر بے چین رہتا تھا کہ لوگ ایسے ہی انجام پر شورِ تحسین بلند کرتے ہیں میرے دوست یہ زندگی سے بعید حقیقت ہے، کیا آپ کو مجھ سے اتفاق ہے؟"

فکر نے کچھ دیر سوچا اور پھر جواب دیا "ہاں میرے دوست آج میں تمہارا ہم خیال ہوں۔ ڈرامہ کا یہ انجام زندگی کی حقیقت سے دور ہے حقیقی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

دلگیر کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ فکر نے مزید تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا "اچھا تو پھر اب یہ بھی بتائیے کہ آپ نے جو ڈرامہ لکھا ہے اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اور یہ کہ وہ لڑکی کون ہے، آپ بتا سکتے ہیں مجھے؟" اسکی آواز "رم" کے اثر سے بھاری ہو رہی تھی اور اسکی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو صرف سطح پر ہی دیکھ سکتی تھیں جھپکنے لگیں۔ اس نے پھر اصرار کیا "یہ کون سی ترقی پسند ادیبہ ہے۔ یہ ترقی پسند نقاد و ادیب کون ہے؟"

دلگیر نے کرسی پرے پھینکی اور اُٹھ کر فکر کے کان میں بڑی رازداری کے ساتھ :۔ "ہم تینوں احمق ہیں۔ تمسخر قدرت کا شکار ہیں۔ تم۔ وہ لڑکی۔ اور میں ـــــ !"

یہ کہہ کر وہ "نرملا کارنر" سے چل پڑا۔ فکر کو خالی گلاس کے عمق میں کھویا ہوا دیکھکر۔ وہ ایک دفعہ اپنے محسن رقیب کو دیکھنے کے لئے رکا اور باہر چلا گیا۔

باہر نکل کر اس نے "قاضی حوض" کا تانگہ لیا۔ وہاں اُتر کر اس نے کرایہ دیا۔ جیب میں سے آخری سگرٹ نکالا۔ رات کافی آچکی تھی ایک پرانی عمارت سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سگرٹ سلگانا چاہتا تھا کہ کچھ خیال آیا۔ سگرٹ پھینک دیا۔ کوٹ کی جیب میں سے ایک لفافہ نکالا جو بہت موٹا تھا۔ شراب کے نشے سے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دیاسلائی کے شعلے کو محفوظ کرتے ہوئے اُس نے لفافہ کے چاروں کونوں میں آگ لگادی۔ کاغذ بھڑ بھڑ جلنے لگے۔ اس کی سیاہی سے لتھڑی ہوئی اُنگلیاں بھی جلنے لگیں۔ اور جب وہ سنبھال نہ سکا تو بدرو میں جلتے ہوئے کاغذ پھینک دیئے۔

جیب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ آخری دوانّی تو وہ تانگے والے کو دے چکا تھا۔ اب کھائے گا کیا۔ وہ اگر مکمل ترقی پسند ادیب ہوتا تو کسی بڑے ادب نواز امیر یا خوشحال دوست کے ہاں جاتا اور رات کو

وہاں رہتا۔ صبح کو ناشتہ اور کھانا کھا کر اور کچھ روپے قرض لیکر اپنی راہ لگتا۔ لیکن وہ غیرتمند تھا اس لئے کم ترقی پسند تھا۔

نشہ میں اُسے دکھائی دیا کہ سامنے سے ایک لڑکا "چل چل رے نوجوان" گنگناتا ہوا آرہا ہے اور اسکے ہاتھ میں ایک کٹوردان ہے۔ سوچا کہ اس سے جھپٹ لوں۔ جونہی وہ سامنے آیا دلگیر نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا۔ گنگناہٹ ایک "ہائیں" میں تبدیل ہوکر رہ گئی۔ "تو کون ہے؟" لڑکے نے کٹوردان اپنی طرف کھینچتے ہوئے اور اس متوحش راہگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بتادوں کہ میں کون ہوں" دلگیر نے لڑکے سے کہا۔

لڑکا سمجھا کہ یہ کوئی پاگل ہے۔

"میں بھوکا ہوں، تین وقت سے۔ تم ساری عمر کسی کی دکان پر کٹوردان نہیں لے جایا کروگے۔ کسی روز تمہیں بھی بھوک ستائیگی۔ اُسوقت تم یاد کروگے کہ کسی نے کیا کہا تھا۔ اُس دن تم مجھے یاد کروگے" اور یہ کہتے کہتے وہ نڈھال ہوکر دیوار سے رگڑتا ہوا نیچے گرا۔ "میرے ننھے ناواقف عزیز خدا حافظ! مجھے یاد رکھنا۔ دنیا یاد رکھے نہ رکھے مگر تم یاد رکھنا۔ میں دلگیر ہوں۔ تمسخر قدرت کا شکار ـــ تم ـــ تم، کچھ، سمجھے میرے پیارے......!"

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(ہلکی طنز میں)

(الف لیلہ کی آخری کہانی جو کہیں نہیں چھپی اور ملکہ شہرزاد کے شارٹ ہینڈ نوٹوں سے مرتب کی گئی!)

"روایت" ہے کہ جب ملکہ شہرزاد اپنی "ایک ہزار اور ایک کہانیاں" سُنا چکی تو وہ حیران تھی کہ کل شب بادشاہ کو کونسا قصّہ سُنائے گی اور اگر وہ نہ سُنا سکی تو بادشاہ اُسے قتل کرادے گا۔

لیکن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس رات کے آنے سے قبل ہی بادشاہ یکایک مرگیا۔ ایک طبیب نے اپنی نہایت قدیم بیاض نکال کر اسبابِ موت تلاش کئے اور بادشاہ کے تھوک کا اپنی لیبارٹری میں معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کا انتقال کسی فوری اشتعالِ اعصاب کے باعث ہوا ہے۔ اس وقت شہرزاد کو یاد آیا کہ شام کو وہ دجلہ میں سیر دریا کے لئے گیا تھا خلیفہ کی ایجاد کردہ "نبیذ"

کا ایک نہایت مفرح "کاکٹیل" اس کے لئے کنیزوں نے تیار کر رکھا تھا۔ جونہی وہ سیر دریا سے فارغ ہوا یہ "کاکٹیل" اُسے پلایا گیا۔ اتفاق کی بات یا عادت یا قضائے الٰہی کہ اس کے مُنہ سے نکلا "الحمدللہ!" اس کا یہ کہنا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور وہ فوراً اپنی "واٹر پروف" جانماز پر لیٹ گیا جو اُس نے لبِ ساحل مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے ابھی ابھی بچھوائی تھی بادشاہ کچھ اس بُری طرح گرا کہ جانماز کی سجدہ گاہ کی طرف جو ایچ۔ ایم وی "۱۲ والوی۔ ریڈیو سیٹ اُس نے پیرس کے "کیفے ڈی واڑوں" کا آرکسٹرا سننے کیلئے رکھ چھوڑا تھا دھڑام سے گر پڑا اور سب چکنا چور ہو گیا۔ بادشاہ کی لاش فوجی احترام کے ساتھ اُٹھائی گئی کیونکہ وہ اپنی سلطنت کا مارشل بھی تھا اور چونکہ مطلق العنان بادشاہ تھا اس لئے "مارشل لا" سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ملکی اور عدالتی افسران و حکام بھی (جنہیں اسوقت جسٹس، قاضی اور آنریبل صدر الصدور کہا جاتا تھا۔) شریک ہوئے۔

شہرزاد کو بادشاہ کی موت کا بڑا صدمہ ہوا اور اس غم میں اُس نے کئی روز تک بغداد کے کسی رقص گاہ اور تھیٹر میں اپنے کمالات موسیقی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

راوی کہتا ہے کہ جب بادشاہ کے "سرکاری سوگ" کی مدت ختم ہو گئی اور لوگوں نے اپنے بازوؤں پر سے سیاہ پٹیاں کھول دیں تو ملکہ شہزاد نے بھی بادلِ ناخواستہ یہ سوگ اٹھا دیا اور ایک بہت بڑا ڈنر عمائدِ بغداد کے اعزاز میں مرتب کیا۔ ڈنر کے بعد جب لوگ ہوانا سگاروں کے کش مزے سے لے رہے تھے ملکہ شہزاد ایک "کھلی کمر" کے نیلے فراک میں میز کے سرے پر آ کر کھڑی ہوئی اور لوگوں کو بتایا کہ "میں نے مرحوم بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ایک قصّہ یک ہزار و دویم شب کے لئے لکھا تھا۔ آج آپ کو سناتی ہوں اور اس کے بعد قصّہ گوئی کا سلسلہ ختم کرتی ہوں کیونکہ اب مجھے قصّہ گوئی سے مطلق نسبت نہیں رہی ہے۔ میرا دل زندگی سے اچاٹ ہو گیا ہے اور اب میں اپنے محبوب بادشاہ کی یاد میں صرف پرواز و رفتار سے دل بہلایا کروں گی۔ میں نے پلاٹینم کی ایک موٹر نیویارک سے منگالی ہے اکثر دنیا کا سفر اسی پر کروں گی اور جب سیرِ عالم سے دل گھبرایا کریگا تو اپنے طیارۂ المونیم پر بیٹھ کر عالمِ علوی کی طرف صعود کر جایا کرونگی۔"

اس "کلامِ بعدِ طعام" کے بعد ملکہ شہزاد نے اپنے شارٹ

ہینڈ نوٹ سامنے رکھکر "فی البدیہہ" ایک افسانہ ہدیۂ سامعین کیا۔ عمائدِ بغداد نے تالیوں کے شورِ تحسین سے ایوان و در کو سر پر اٹھالیا۔ نصف شب کے بعد یہ محفلِ ادب و حسن و کیف ختم ہوئی۔ کنیزوں نے اپنے اپنے پاس کے بٹن دبادئے قندیلیں اور کافوری قمقمے یکدم تاریک ہوگئے اور ملکہ شہرزاد اپنے بیڈروم میں چلی گئی اور کنیزوں کو یہ حکم دے گئی کہ صبح کو مجھے نماز کے وقت اٹھادیا جائے کیونکہ میں توقع کرتی ہوں کہ شاید کوئی اہم ٹیلیگرام مجھے پیرس سے موصول ہونے والا ہے۔ شاید مجھے اپنی سلطنت کی نمائندگی کے لئے "موتمرِ سیاست عالم" میں شریک ہونے کے لئے جلد روانہ ہونا پڑے۔

ملکہ شہرزاد کے شارٹ ہینڈ نوٹ "عجائب خانۂ تصوّر" سے حاصل کرکے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ قصّہ کاپی رائیٹ ہے اور اس کی رجسٹری خلیفہ ہارون رشید کے دفتر میں پیٹنٹ اینڈ کاپی رائیٹ ایکٹ کے ماتحت باقاعدہ ہوچکی ہے اس لئے کوئی صاحب اس کے کل یا جزو کو شائع و ترجمہ نہ فرمائیں ورنہ عدالتِ ہارون رشید میں لکھنے والا افریادی ہوگا اور ملزم کو قرار واقعی سزا

دلوائے بغیر بہشت رسید نہیں ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ؛۔

سُنا ہے کہ شہر بغداد میں ایک سوداگر رہتا تھا جس کی صرف ایک ہی بیوی تھی ——"ایلاس!" (افسوس!) وہ صبح کی چاء پینے کے لئے بچوّں کی "نرسری" میں ہی چلی جاتی تھی کیونکہ سوداگر بچہ سے وہ ناخوش تھی۔ ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ سوداگر کی بیوی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سوداگر کا نام دانیال تھا۔

دانیال نے جب خلاف توقع اپنی بیوی کو آتے دیکھا تو وہ مسکرایا اور جھک کے "صبح بخیر" بجالایا۔ اور اپنی حیرانی کو چھپانے کے لئے پھر "بغداد ٹائمز" کے اوراق میں محو ہوگیا۔

دانیال سوداگر نے "کیفستان سگرٹ" کا دھواں کمرے میں طاری کرتے ہوئے پوچھا؛ "ڈارلنگ زرینہ کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو——؟"

زرینہ نے اپنے پلیٹ فارم ہیل والے سینڈیل کارڈ ٹیبل پر دراز کرتے ہوئے کہا؛ "اوہ ڈارلنگ، دانیال، کیا تم مہربانی کر کے میری ایک بات سُننا پسند کروگے؟ میں یہ کہنے کی معافی چاہتی ہوں کہ آج تم ایک عنایت کرو۔"

دانیال نے اس رسمی پُر تکلف گفتگو کا کچھ مطلب نہ سمجھتے ہوئے کہا؛ "ضرور جلدی کہو مجھے آج ذرا جلدی آفس جانا ہے کچھ جواہرات اور ریشمی

پارچوں کے "ایکس پورٹرز" شنگھائی سے آنے والے ہیں اور میرا سکریٹری بھی آج کل "انفلوئنزا سے بیمار" ہے اس لئے مجھے ہی ان سے بات کرنی ہوگی کیونکہ وہ دو بجے کے طیارہ سے واپس شنگھائی جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اولمپک کا چمپین باکسر ہے جو وہاں مقابلہ میں......"

دانیال کی بیوی نے بات کاٹ کر کہا: "اچھا تو جلدی سنیئے۔ میں چاہتی ہوں کہ آج کی شام آپ مجھے دے دیں۔ میں نے سُنا ہے کہ "بوستانِ بغداد" میں ایک بہت عمدہ فلم چل رہا ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ سینما شو کے بعد ندیم رقاص اپنے عریاں رقصوں کا مظاہرہ کرے گا اور اس کے ساتھ شاید اس کی لڑکی بھی ہوگی۔ کاش تم میرے ساتھ اس پُرجمال نظارہ کو دیکھنے کے وقت موجود ہو...... کوئی تین مہینے ہونے آئے ہیں اور تم نے مجھے اپنی "ایک شام" بھی نہیں دی ہے!"

دانیال کچھ جز بز ہوگیا۔ وہ حیران تھا کہ ایک جدید عورت کیوں ہمیشہ اپنے ہی خاوند کے ساتھ شامیں گذارنے کے لئے مُصر ہو۔ بہرحال اس نے کہا: "اچھا تین مہینے ہوگئے اس بات کو ــــ اولارڈ! بزنس کی مصروفیتیں!"

بیوی نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے ذرا جھنجلا کر کہا: "میں نے اس عرصہ میں آپ سے کہا بھی نہیں کیونکہ بار بار کے انکار میری کافی توہین کر چکے ہیں...... اس لئے دانیال ڈارلنگ میں نے یہ فیصلہ

کر لیا تھا کہ جب تک تم خود میرے ساتھ شام گذارنے کی کبھی خواہش ظاہر نہیں کرو گے میں بھی چپ رہوں گی۔ میں نے آج ندیم کے عریاں رقص کا مظاہرہ دیکھنے کے لئے "بوستانِ بغداد" میں دو نشستیں محفوظ کرالی تھیں۔ ایک اپنے لئے اور دوسری آمنہ کے لئے۔ مگر آمنہ نے مجھے ابھی فون کیا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ دجلہ کی کشتی رانی کے مقابلہ میں جا رہی ہے۔ اس لئے سینما میں نہیں جا سکے گی۔ اب میں حیران ہوں کہ کسے اپنے ساتھ لے جاؤں..... یہ کس قدر افسردہ اور بیحد دردناک شام ہو گی کہ میں ایک خالی نشست کے پاس بیٹھ کر سینما اور رقص دیکھوں۔ اور ہاں وہ میرے "ادپیرا گلاس" ٹھیک ہو کر آ گئے؟"

"ہاں آ گئے ہیں۔ سنگھار میز کی دراز میں ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے نکالنا کہیں میری رسٹ واچ نہ خراب ہو جائے۔"

"اچھا تو پھر بولو کیا کہتے ہو؟ ڈارلنگ۔"

"کسی مرد کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"یہ تو تم خوب جانتے ہو کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ باہر اگر کسی مرد کے ساتھ میں جاؤں گی تو صرف تمہارے ساتھ۔"

دانیال نے کہا: "اوہ! کس قدر فرسودہ قسم کی قسمیں کھایا کرتی ہو!"

تھوڑی دیر تک وہ اپنے شب خوابی کے لبادہ سے کھیلتا رہا اور کچھ سوچ کر بولا: "تو پھر فیصلہ یہ ہے کہ میں دفتر جا کر یہ دیکھوں گا کہ شام کو

مجھے کوئی غیر معمولی مصروفیتِ تجارت یا سماجی نوعیت کی تو نہیں ہے! اگر میں چل سکا تو ضرور تمہارے ساتھ یہ شام گذار نا پسند کرونگا۔"

دانیال کی بیوی جھٹ سے چلائی "اوفو! تم کس قدر پیارے دوست ہو!"

دانیال مسکرایا "اور شوہر نہیں؟"

"وہ تو ہو گا ہی!" دانیال کی بیوی نے جواب دیا مگر وہ ذرا متامل ہو گئی یہ سنکر کہ دانیال کہہ رہا تھا "میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا..... میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کوشش کرونگا۔"

دانیال نے اپنی "دو گا نی" موٹر نکلوائی اور اپنے دفتر میں جا پہنچا جہاں اس کا بزنس تھا۔ ایک کمرہ میں گھسا جس کے باہر "تخلیہ" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر جا کر اس نے "۴۱۰۳۴" نمبر ملا کر سننا شروع کیا۔

اس نے "صاعقہ بنت حافظ" کو ٹیلیفون کیا تھا جو ایک بہت امیر و دلربا ادیبہ تھی۔ دانیال اس سے بغداد کی تفریح گاہوں اور سرکاری تقریبات کے مواقع پر ملا کرتا تھا۔ مگر پچھلے چند ہفتوں سے دونوں میں "آزاد محبت" کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

"کیا تم ہو؟" دانیال نے ذرا مدھم طریقہ سے کہا تاکہ اسکی سٹینو، نادرہ جو برابر کے کمرہ میں کل کے لکھوائے ہوئے نوٹوں کو ٹائپ کر رہی

تھی اس کی آواز نہ سن لے۔

"کیا تم ہی ہو صاعقہ! اچھا ذرا غور سے سنو۔ کیا یہ بات طے ہے کہ آج رات تم میرے ساتھ کہیں باہر چلو گی؟ دیکھو ایسا نہ کرنا کہ پچھلی دفعہ کی طرح عین وقت پر کہہ دو کہ میں افسوس کرتی ہوں کہ نہیں چل سکتی!"

"اوہ! تم کس قدر باتونی ہو گئے ہو دانیال۔ کس قدر عمدگی کے ساتھ عورت کو پھانستے ہو۔ سارا بغداد تمہاری داد دیتا ہے۔ مگر میری عادت ہے کہ صرف اُنہیں چیزوں سے خوش ہوتی ہوں کہ بروقت ہوں اور عین وقت پر وہ سوجھیں ___ کیا تم میرا حظ خراب کرنا چاہتے ہو؟"

دانیال نے پیپر ویٹ سے ایک چیک کو جو برقی پنکھے سے اُڑا جا رہا تھا جلدی سے دباتے ہوئے جواب دیا "معاف کرنا صاعقہ! تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں تم کو کس قدر پسند کرتا ہوں اور جب سے ہم دوست بنے ہیں بغداد کے سوشل حلقوں میں ہماری پکی اور پُرخلوص دوستی کا چرچا ہے۔ کل ہی مادام طوری کے ہاں ہم لوگ "چاء پر" تھے کہ وہاں تمہارا ذکر آ گیا۔ وہاں یونیورسٹی کی کئی لڑکیاں بھی تھیں وہ ....."

"اچھا۔ اچھا۔ یہ سب سُن لیا۔ میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ مجھے کچھ دیر بعد بلکہ بعد ظہر ٹیلیفون پر بُلانا۔ میرا فرنچ ماسٹر آتا ہو گا اس سے سبق لے لوں اور پروگرام پر نظر ڈال لوں تب مجھ سے کوئی آخری بات طے کر سکو گے۔"

"بہت اچھا۔"

لنچ پر دانیال کی بیوی نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ "کیا میں بھروسہ کروں کہ تم میری ہمراہی میں سینما چلو گے؟"

دانیال نے ذرا چڑچڑے پن سے جواب دیا کہ "میں آج بہت مصروف رہا، ابھی تک مجھے ٹیلیفون کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شاید بغداد گورنمنٹ کے سکریٹریٹ سے مجھے بلاوا آئے، وہاں آج ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ بہرحال میں شام کو ہی اکرم کو صحیح خبر دے سکونگا۔"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی، صاعقہ بنت حافظ بغداد پارلیمنٹ کے ایک رکن موسیو صدوری کو ٹیلیفون کر رہی تھی، جس سے وہ جنیوا میں ملی تھی اور موسم گرما کے اختتام تک جس سے عشق کرنے کا وہ وعدہ کر چکی تھی۔

"کیا تم ہو صدوری؟" صاعقہ نے پوچھا۔

ایک حبشی کنیز نے جواب دیا کہ "موسیو صدوری اس وقت شیو کر رہے ہیں۔ وہ ابھی سو تے اُٹھے ہیں کیونکہ صبح تک وہ خلیفہ ہارون رشید کے ہاں تھے۔ کل رات مامون رشید کی سالگرہ کا جشن تھا اور اس کا فلم لیا جا رہا تھا اس لئے کسی کو صبح سے پہلے آنے کی فرصت نہ مل سکی۔ واپس آکر سو گئے۔"

"اچھا آپ ہیں مادام نوری۔ موسیو صدوری سے کہیئے کہ میں بول رہی ہوں صاعقہ...... اچھا۔ تو پھر رہنے دو۔ اگر انہیں تم جا کر نہیں تو خیر جانے دو.....

کیا تمہیں یاد ہے کہ آج رات وہ کس خاتون کے ساتھ کس
کیفے میں جارہے ہیں ...... ہاں. ضرور اُن کی مصروفیت
کی کتاب" دیکھو. کسی کالم میں میرا نام ہے ـــــ اچھا.
بس ـــ ٹھیک ہے ـــ لیکن وہ کہیں ایسا تو نہیں
کریں گے کہ عین وقت پر مجھے جواب دے دیں کہ افسوس
ہے میں آپ کے ساتھ اس شام کو نہیں چل سکتا مجھے
تو قاضی رُشدی کی لڑکی کے ساتھ آج مون لائیٹ
پک نک میں جانا ہے یا کسی اور خاتون سے وہ کہیں
جانے کی باتیں کرلیں اور میں ...... اچھا خیر. مناسب
ہے. خدا حافظ!"

دانیال نے لنچ کے بعد صاعقہ کو ٹیلیفون کیا. کنیز نے جواب دیا
کہ "مادام کو بہت افسوس ہے کہ وہ آج شام آپ کیلئے نہیں نکال سکتیں
کیونکہ انہیں امیر ابوالمعالیٰ کے ہاں جانا ہے"

یہ سُنکر دانیال سوداگر سیدھا اپنے گھر آیا تاکہ بیوی کو خوش
کرنے والی خبر سناسکے کہ اُسے آج شام کو تجارتی یا سماجی قسم کی کوئی
مصروفیت نہیں ہے. پچھلے دو تین ماہ سے اس نے اپنی بیوی کے
خیال کے مطابق کوئی چھٹی ہی نہیں منائی تھی اور آج کی شام اُس
کے لیے بہترین موقع تھی.

دانیال نے آکر دیکھا کہ اُس کی بیوی سینما جانے کی تیاری میں

مصروف ہے. کوچ پر فرکوٹ، ٹارچ، اوپیرا گلاس، غرض رات کی واپسی اور سینما دیکھنے کی تمام ضروری چیزیں ایک لمبی کوچ پر پڑی ہوئی ہیں۔

"پیاری تم کو یہ سنکر کس قدر خوشی ہوگی کہ میں نے آخرکار کسی نہ کسی طرح تمام ضروری کام نبیڑ دئے اور آج کی شام تمہارے لئے اور صرف تمہاری خاطر نکال ہی لی. میں تمہارے ساتھ آج ضرور چلونگا. میں تو ہمیشہ ہی یہ چاہتا......"

شرم اور خوشی کے مارے گلاب رو بیوی نے کہا: "تم کس قدر اچھے ہو ڈارلنگ! کس قدر پیارے! مجھ سے زیادہ خوش قسمت بیوی اور تم سے زیادہ وفادار شوہر آج کل کے بغداد میں تو کہیں ملے گا نہیں!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو! پیاری۔ لو یہ چوسنے کا گوند! بالکل نیا آیا ہے شاید تم پسند کرو گی"

اور جب سوداگر بچہ کمرے سے باہر چلا گیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی. اور سوداگر کی بیوی نے جواب دیا:-

"ہاں میں ہی بول رہی ہوں ــــ اچھا. تو تم آج کس کے ساتھ جا رہے ہو ــــ صاــــ کیا نام لیا ــــ "صاــــ عےــــ قا؟ اچھا. جاؤ. اس کے ساتھ. اَب

ہم سے نہ بولنا۔ میں بھی آج موسیو دانیال کے ساتھ جاؤنگی۔"
یہ کہکر سوداگر کی بیوی نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ وہ بہت دیر تک دل میں سوچتی رہی کہ دانیال کس قدر نیک شوہر ہے اور اسکے بارے میں اس کے اندازے اور گمان کس قدر غلط تھے۔ دانیال جیسے فرشتے اب بغداد میں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ کاش وہ دانیال کی "وفا پرور محبت" کی قدر کر سکتی!۔

ایک تھا اناؤنسر

پہلے لوگوں کو نام سُنکر عشق ہو جایا کرتا تھا اب صرف آواز سُننے سے ہو جاتا ہے۔ کالج میں اُسے عشق سے کوئی لگاؤ نہیں ہوا۔ جب وہ پڑھانے لگی، اسی کالج میں پڑھانے لگی، تب بھی اُسے مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ لیکن یکایک اُس نے محسوس کیا کہ جب وہ ریڈیو سنتی ہے ایک خاص اناؤنسر کی آواز اسے بہت پسند آتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو اس آواز سے اُنسیت ہو گئی۔

خوبصورتی اور تعلیمی لیاقت کے اعتبار سے وہ ہزاروں میں ایک تھی اور "سُندرتا" نام اُسے زیب دیتا تھا۔

سندرتا اس اناؤنسر سے بالکل واقف نہ تھی۔ کبھی اُسے دیکھا نہ تھا لیکن رات کو جب وہ کالج کا کام کرنے کے بعد آرام سے پلنگ پر لیٹتی تو اس اناؤنسر کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی اس کے پاس رومان کے تحفے لئے ہوئے حاضر ہوتی۔ اسکی زندگی اس فضائی رومان سے اب ہر رات کو لبریز ہونے لگی۔

آج تک ایسی خوبصورت اور دلنشیں آواز اُسکے کانوں میں نہیں

پڑی تھی۔ خبروں کا بلیٹن میرے آپ کے لیے ایک معمولی توجہ کی چیز ہے، سُنا سُنا نہ سُنا سُنا مگر سُنندرتا کے لئے رات کے نو بجے براڈکاسٹ ہونیوالا نیوز بلیٹن جگرؔ کی غزل سے کم دلآویز نہ ہوتا تھا بلکہ "بازار کے بھاؤ" بھی سُنکر اُسے ایسا ہی مزا آتا تھا جیسے "میراجی" کی بلینک ورس سن رہی ہو۔

وہ سارا پروگرام سنتی تھی۔ فرصت کا سارا وقت ریڈیو سے کان لگائے گذرتا تھا۔ دیہاتی پروگرام ہو یا خبریں یا اور کوئی فضائی سمع خراشی سُنندرتا کو ان سب سے یک گونہ مناسبت قلبی تھی، مضمون کی خاطر نہیں، آواز کی وجہ سے۔ زندگی اس کے لئے اب آواز ہی آواز ہو کر رہ گئی تھی!

جب وہ نہیں بولتا تھا تو اُسے سخت رنج ہوتا تھا۔ مگر جس دم وہ بولنے لگتا تو اس کا سارا جسم سماعت مجسم بن جاتا۔ وہ اس کی آواز کی باریک سے باریک خوبصورتی کو بھی سنے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسکی آواز سُنکر اس کے تن بدن میں ایک ہلکی ہلکی گرمی سی تھرتھراتی ہوئی گذر جاتی تھی۔

جی نہیں۔ اُس نے آج تک اس اناؤنسر کو نہیں دیکھا تھا، مگر اس کی کس قدر اُمیدیں اس خیال پر مرکوز رہا کرتی تھیں کہ کسی روز وہ اس سے ضرور ملے گی۔ کاش کوئی اس کا تعارف کرا سکتا۔ کاش کوئی اُسے بتا سکتا کہ ایک زمانہ کالج کی پروفیسر تیری آواز پر شیدا ہے۔ اس کی زندگی کی یہ خواہش کاش کبھی پوری ہوتی۔

کیسی تھرتھری اُسے محسوس ہوگی جب پہلی بار وہ اپنے اناؤنسر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گی.

ایک دفعہ سنندتا نے سوچا کہ اسے خط ہی لکھے. مگر اُسے اناؤنسر کا نام تو معلوم ہی نہ تھا. ایک اناؤنسر تو تھا نہیں. اتنے اناؤنسروں میں سے ایک خاص اناؤنسر کی آواز کو کس طرح لفافہ پر ظاہر کیا جاسکتا ہے. اور کیا صحیح اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ ٹھیک اُسی آدمی کے پاس اس کی چٹھی پہونچے.

کالج قریب ہی تھا. کام کے بعد خالی وقفوں میں وہ آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی ریڈیو اسٹیشن کے سامنے چکر لگانے لگتی. اور دل ہی دل میں یہ سوچتی کہ کاش وہ اس وقت اسٹیشن سے نکلتا ہوا مجھے دیکھ لے. وہ پاس سے گذر رہا ہو. وہ اس کی آواز پہچان لے اور تعارف ہو جائے.

مگر یہ اناؤنسر نہ جانے کہاں الوپ رہتا تھا. اسٹیشن سے باہر نکلتا ہی نہ تھا یا کیا بات تھی کہ سنندتا نے اُسے آج تک نہ دیکھا. اس قسم کے برتر و فوق الفطرت انسان کسی اور دروازے سے نکل کر چلے جاتے ہونگے.

شاید ایسے حسین انسانوں کے لئے کوئی سنہری دروازہ الگ بنوایا گیا ہوگا!

وہ مایوس ہوگئی. ہزارہا چکر کاٹنے کے باوجود وہ ایک دفعہ بھی

اس خوبصورت اناؤنسر کی جھلک نہ دیکھ سکی۔

پھر اس نے یہ سوچا کہ کسی ایسے آدمی سے جان پہچان پیدا کی جائے جو کسی ایسے آدمی کو جانتا ہو جو ریڈیو کے سب آدمیوں کو جانتا ہو، لیکن اُس نے کافی پریشانی اُٹھانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی کسی ایسے آدمی سے واقفیت نہیں ہے جو کسی ایسے آدمی کو جانتا ہو جو ریڈیو کے سب آدمیوں کو جانتا ہو۔

غرض سُندرتا کا سارا دن رنج کے ساتھ اور تقریباً آدھی شب اسکی آواز کی خوبصورتیاں محسوس کرنے میں گذرتی تھیں، وہ اس کی آواز ہی سنکر مطمئن سی ہو جایا کرتی تھی۔

وہ ریڈیو کھول کر ایک طرف آرام کرسی پر لیٹ جاتی اور تصوّر کو مہمیز دیتی کہ وہ کیسا ہوگا۔

لمبا تو وہ ہوگا ہی۔ خوبصورت لمبا نرمرد۔ آنکھیں شاداب۔ پتلے ہونٹ۔ چھوٹا دہانہ۔ مضبوط ہاتھ پیر، غرض عورتیں جس قسم کے مرد کو پسند کرتی ہیں۔ بلکہ کوئی بھی جیسے مرد کو خوبصورت سمجھتا ہے وہ ان تمام صفات کا نمونہ ہوگا۔

اس کی مسکراہٹ بہت شاندار اور رسیلی ہوگی۔ کہکشاں کی شاہراہ پر اگر سب ستارے ایک ساتھ دوڑنے لگیں تو اُن کے ٹکرانے سے کیا خوبصورت آہنگ پیدا ہوگا بس ایسے ہی آہنگ کے ساتھ وہ کبھی کبھی قہقہہ لگاتا ہوگا۔

اس کی ایک خاص مسکراہٹ ہوگی جو ریڈیو والوں نے کبھی نہ دیکھی ہوگی اور ایک خاص قہقہہ اس کا الگ ہوگا جو کسی ریڈیو سننے والے کے لئے نہیں بلکہ صرف ان چند مخصوص ہستیوں کیلئے اس نے محفوظ کر رکھا ہوگا جنہیں وہ دل سے پسند کرتا ہوگا۔ مثلاً.....

سندرتا اپنے خیال کی اس منزل پہ جب پہونچی تو وہ ایک دم چونک پڑی۔ اور جو اگر اسکی شادی ہو چکی ہو تو پھر کیا ہوگا!؟

بہت ممکن ہے کہ اس شہزادۂ آہنگ کی ایک ملکہ بھی ہو! پھر سندرتا کی طرف وہ کیوں دیکھنے لگا۔

یہ کسقدر ہولناک تخیّل تھا وہ سوچکر ایک آہ سرد بھرنے ہی والی تھی کہ ایک اور خیال نے اُسے چونکا دیا۔ یہ خیال اس سے بھی زیادہ ہولناک تھا۔ اور جو اگر اس اناؤنسر کو چپکے چپکے پیار کرتی ہوئی وہ بوڑھی ہوتی چلی گئی اور ساری عمر اس سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تو یہ زندگی اسکے لئے کسقدر ہیچ ہوگی!

یہ سوچ کر اُس نے آخر کار سینہ میں گھٹی ہوئی آہِ سرد کو باہر نکلنے کی اجازت دے ہی دی۔ اور اس کام سے فارغ ہوکر وہ آرام کرسی کی پوری وسعت میں سماتی چلی گئی۔ اس جسمانی آرام نے اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند کرنی شروع کردیں۔ اس کا تصوّری کارواں پھر ایک مقام پر آکر رکا۔ جب یہ زندگی آواز ہی آواز ہے تو کیوں نہ وہ بھی ہم آہنگ حیات ہو جائے۔ کیوں نہ وہ کالج کی ملازمت چھوڑ کر ریڈیو

میں آجائے۔ اُف ریڈیو! آواز سے اُسے عشق تھا۔ وہ بھی وہاں ہوگا۔ دونوں مل کر اناؤنس کیا کریں گے۔ دونوں مل کر عشقیہ ڈراموں میں پارٹ کیا کریں گے۔ غرض ایک بہشت ہوگی۔ کاش وہ گھر والوں سے جھگڑ کر جلد از جلد اس کالج کو لات مار کر ریڈیو میں پہونچ سکتی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی پہونچ اس عالم میں ہوگئی جہاں نہ آوازیں آتی ہیں نہ خوشبوئیں۔

کئی روز کے بعد اس کی نگاہیں "انڈین ٹائمز" کے ایک اشتہار پر جم کر رہ گئیں۔ جیسے مکھی مار کاغذ پر مکھی لالچ میں آکر بیٹھ جاتی ہے، اور پھر کسی عنوان، جان دئے بغیر، اس پھندے سے نہیں نکل سکتی، ایسی ہی حالت سُندرتا کی ہوئی۔

اشتہار کا مضمون یہ تھا کہ ہندوستانی براڈکاسٹنگ اسٹیشن میں ایک صاحب کے عارضی طور پر چلے جانے کے باعث ایک ملازمت اناؤنسر کی جگہ کے لئے خالی ہوئی ہے اچھی آواز والے مرد اور عورت اس کیلئے درخواست دے سکتے ہیں۔

چنانچہ یہ خود وہاں پہونچی۔ سٹوڈیو کے دروازے ہی سے اُسے ایک لمبے سے آدمی نے اس طرح اُچک لیا جیسے ٹینس کے بلّے پر چالاک کھلاڑی گیند کو لپک لیتا ہے۔ سندرتا نے فوراً محسوس کرلیا کہ اس لمبے آدمی کی آواز اس ناؤنسر کی سی نہیں ہے۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ناؤنسر تھا مگر اس میں جسمانی بڑائی اور درازیٔ زبان کے علاوہ اور کوئی خوبی

نہ تھی. وہ لوچ وہ خوبصورتی! اف وہ اناؤنسر کہاں تھا!
خیر. سندرتا نے آواز کا ٹیسٹ دیا۔ اس کی ظاہری آرائش اور اعلیٰ تعلیم ان دونوں چیزوں نے ریڈیو والوں کو خواہ مخواہ اس موقع کے لئے خوش اخلاق بنا دیا اور وہ اناؤنسر کی جگہ پر لے لی گئی۔
پندرہ روز کی ریڈیو کی زندگی میں اس نے اندازہ لگایا کہ اگر مصنوعی عشق کرنا ہے تو یہاں بہت گنجائش ہے۔ اس نے اپنے دل کا بھید کسی کو نہ دیا۔ اسے ریڈیو سے نفرت ہو گئی. ریڈیو میں وہ آواز ہی جب نہ سنائی دے تو زندگی اس کیلئے ہیچ تھی۔
اس کی پژمردہ زندگی نے آخر کار ایک راہِ انتقام نکال ہی لی۔ اُس نے ایک ایک اناؤنسر سے مصنوعی عشق کر کے دیکھا سب کو کھوکھلا پایا۔ بیہودہ بدمذاق نیم خواندہ۔ صرف ایک ہی عمدہ تعلیم یافتہ اور پُرشوکت آدمی تھا اور وہ دراز قد اناؤنسر تھا جس نے اس کا پہلے ہی روز سے دروازہ سے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر چند اسے ٹالنا چاہتی تھی، لیکن وہ تسمہ پا کی طرح ہر وقت اس سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ اس اناؤنسر کی پبلک طریقے پر ہر موقع محل پر جان بوجھ کر توہین کرتی رہتی تھی، مگر وہ باز ہی نہ آتا تھا۔ سندرتا کو اس پر کبھی کبھی رحم بھی آتا تھا مگر یہ رحم بہت جلد اس کی کسی احمقانہ جرأت کے ہاتھوں فوراً جذبۂ تحقیر سے بدل جاتا تھا۔ مگر کب تک. عورت آخر کار عورت بن کر رہتی ہے۔

کئی مہینے وہ اس دراز قدچرب زبان اناؤنسر کی توجہات بلیغ کا مرکز
بنی رہی مگر آخر کار اُسے یہ ملازمت چھوڑ کر پھر کالج کی طرف رجوع
ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ زیادہ عرصہ تک اپنی مغلوب فطرت کے ہاتھوں
برباد نہیں رہ سکتی تھی۔

اس رومان نے اُسے کوئی آسودگیِ روح نہ بخشی۔ اسکی انتہائی
مسرت کی شام وہ تھی جب اُس نے کئی مہینے بعد پھر اس اناؤنسر کی آواز
ایک بار پھر اپنے ریڈیو پر سُنی۔ اس کی خوابیدہ حیات میں ایک نئی لرزش
احساس پیدا ہو گئی۔ کاش وہ ریڈیو اسٹیشن جا سکتی۔ مگر اس کی کمزوریوں
کے قصّے اب وہاں اس قدر براڈ کاسٹ ہو چکے تھے کہ اس میں ریڈیو
کے احاطہ میں جانے کی جراءت نہ تھی۔

ایک دن اُسے ڈاک میں ایک خط ملا۔ جلدی سے اُسے کھولا۔
کسی اجنبی کا خط! جلدی سے نیچے دیکھا، لکھنے والے کا نام تھا۔
" للت کمار!"

سندرتا تو کسی ایسے آدمی سے واقف نہ تھی۔ نہ اس خط کو وہ پہچان
سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی کُرسی پر سنبھل کر بیٹھی۔ خط پڑھنا شروع

کیا مضمون تھا۔

"ڈیر مس سندرتا!

مَیں اُس جگہ ڈرتے ڈرتے قدم رکھ رہا ہوں جہاں شاید فرشتوں کے پر بھی جلتے ہوں گے، لیکن مجھے آپ سے دلی اُنس ہو گیا ہے۔ مَیں نے معلوم کیا کہ جب مَیں بیماری کی لمبی چھٹی پر گیا ہوا تھا آپ میری جگہ اس اسٹیشن پر اناؤنسر کا کام کرتی رہیں۔ مَیں آپ کی آواز کبھی کبھی ریڈیو میں سُنا کرتا تھا۔ کس قدر حسین اور دلکش آواز ہے۔ مجھے ان واقعات سے بھی ہمدردی ہے جو ایک دو مہینے میں آپ کی ذات سے متعلق یہاں برپا کیے گئے اور آپ کو متہم کر کے یہاں سے علیحدہ کیا گیا۔ خیر ان باتوں کو جانے دیجئے مجھے تو آپ سے غرض ہے۔ دُنیا کچھ بھی بکا کرے میرے دل میں تو آپ کی اور بھی قدر بڑھ گئی ہے۔ کاش میری آواز اس قدر سُندر ہو سکتی۔ کاش مجھے قدرت اس نفیس آہنگ سے مالا مال کر سکتی میں نے آپ کو دُور سے دیکھا ہے۔ آپ اکثر کالج کے سامنے والی سڑک سے جلدی جلدی آ کر ہمارے اسٹوڈیو کے چمن پر طائرانہ نظر ڈالتی ہوئی روز گذرا کرتی تھیں۔ مَیں تو عرصہ تک یہی سمجھتا رہا کہ آپ اب بھی پڑھاتی ہوں گی۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ آپ نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر ریڈیو میں نوکری کر لی اور ہمارے آنے سے پہلے ہی آپ چلی گئیں۔ کاش آپ مجھے چند لمحے ملنے کے دے سکیں۔ اُمید ہے آپ ایک ریڈیو اناؤنسر کی اس جرأت کو معاف کریں گی۔ میں ایک حقیر آدمی ہوں مگر میرا دل

بہت بڑا ہی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے قلب کی وسعت و خوبصورتی کو دیکھیں گی نہ کہ ظاہری طمطراق اور بیرونی آرائشوں کو۔ اگر کبھی آپ مجھ ملنے کا موقع دیں تو میں اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھونگا۔ میں ایک ایک لمحہ بعد ڈاکیہ کی آہٹ کا منتظر رہونگا۔ کاش آپ اس جرات کو معاف فرمائیں۔"

سندرتا نے اس چٹھی کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ آخرکار!

صبح کو سات بجے اس نے پھر ریڈیو سُنا۔ اسی کی آواز تھی۔ کیسی نقرئی جھنکار تھی۔ وہ اس سے مل کر کسقدر خوش ہوگی۔ اس کی بیقرار رُوح کو کتنی تسلّی ہوگی۔ وہ جس ہم آہنگیِ حیات کے لئے گئی تھی وہ اُسے خود ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ بیشک صحیح ہے۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے!۔

ہاں یہ اسی کی آواز تھی۔ جسے وہ مہینوں سے سُن سُن کر تباہ ہو رہی تھی۔ سندرتا اٹھی جھٹ کاغذ نکال کر لائی اور للت کمار کو اس نے لکھا۔

"میں نے خود آپ کی آواز اس قدر پسند کی ہے اور اتنے عرصہ سے پسند کرتی چلی آرہی ہوں کہ تقریباً دیوانی ہوگئی ہوں بلکہ اس دیوان پن میں اپنا بہت کچھ، جس پر مجھے ناز تھا، برباد کر چکی ہوں۔ چاپلوسی کے چکنے فرش پر بے خیالی میں پھسل کر بہت کچھ کھو چکی ہوں لیکن آپ کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ مجھ سے آپ ضرور ملئے۔ کہاں ملیں گے؟ ضرور جواب دیجئے۔"

خط ڈاک میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے روز جواب ملا۔ کیوں نہ کناٹ پیلس میں کسی جگہ ملیں۔ میرے خیال میں "کیفے ساقی" میں آپ مجھے مل جائیے۔ کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گے۔ یہ ریسٹوران مجھے بہت پسند ہے کیونکہ یہاں "کافی" نہیں ملتی۔ "کافی" سے مجھے دلی نفرت ہے کیونکہ وہ ایک ایسے آدمی کو پسند ہے جسے میں ناپسند کرتی ہوں۔ مگر چند روز تک نہ کر سکی۔ خیر۔ یہ سب قصّے زبانی ملنے پر سناؤں گی۔ آپ آئیے تو سہی مجھے آپ پہچان لیں گے۔ سُرخ دوپٹے اور سفید ساٹن کے سوٹ میں عین کاؤنٹر کے سامنے والی سیٹ پر شام کے سات بجے سے آپ کا کل ضرور انتظار کروں گی۔

دوسرے روز سندرتا نے سفید ساٹن کی شلوار اور قمیص پہنی۔ سُرخ دوپٹہ کندھوں پر چسپاں کیا اور "کیفے ساقی" کی طرف چلی۔ بس میں بیٹھکر سات بجے سے چند منٹ پہلے ریسٹوران پہونچ گئی۔

بظاہر وہ کس قدر مطمئن اور غیر مضطرب نظر آرہی تھی۔ اندرونی طور پر اس کی کیفیت ایک بخار چڑھے ہوئے بچّے کی مانند تھی جو کپکپا رہا ہو۔ مگر اُسے معلوم نہ ہو کہ سردی کی وجہ سے ہے، باہر کی خنکی کی وجہ سے یا اندرونی حرارت کی وجہ سے!

وہ باہر آنے جانے والے مرد کی طرف متجسس نظروں سے دیکھتی تھی۔ سندرتا خود کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ مرد اس کے دیکھنے پر خود بخود

اُسے دیکھنے لگتے تھے۔ وہ اس وقت اپنے محبوب اناؤنسر کی تصویر ذہن میں کھینچ رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ اس کا چہرہ اس قدر غیر معمولی کشش لئے ہوئے ہوگا کہ ہزاروں آدمیوں میں بھی وہ اُسے پہچان لیگی۔ جیسے ہی وہ کیفے کے ہال میں قدم رکھے گا یہ اسے فوراً ایک نظر میں پہچان لیگی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی چہرے کو اپنے محبوب سے متعلق کرکے سوچ اور وہ اس کا نہ نکلے۔ اور وہ اپنے خیالات کی رَو میں اس قدر بہی، اس خواب بیداری نے اُسے اس قدر اپنے سحر میں ملفوف کیا کہ کئی منٹ تک اُسے یہ محسوس نہ ہوسکا کہ یہ جو پستہ قد باچھوں تک پان کی پیک بہلئے ہوا انسان اس کی طرف ملتجی انداز میں جُھکا ہوا کھڑا ہے، کون ہے۔ اُس نے اُسے دیکھا بیشک تھا۔ خاکی زین کا داغدار کوٹ پہنے، پیروں میں چپلیں اور گھٹنوں پر سے مسکا ہوا پاجامہ پہنے۔ بیشک ایک قریب آنے والا آدمی ضرور تھا۔ مگر سندرتا کو اس سے کیا۔ وہ کسی کا ڈرائیور معلوم ہورہا تھا۔ شاید یہ پوچھنے آیا تھا اپنے صاحب سے کہ گاڑی لیجاؤں یا آپ کیلئے چھوڑ جاؤں۔

یہ دُبلا، پتلا، فاقہ زدہ انسان بڑی دیر تک میز کے نزدیک ملتفت انداز میں جھکا کھڑا رہا۔ کئی منٹ کے بعد سندرتا نے محسوس کیا کہ یہ بھی کوئی ہے!

اس نے اپنی نظریں اُٹھائیں تو اس آدمی کے بولنے کی آواز آئی۔ کیسی حسین آواز! "مس سندرتا! معاف کیجئے گا مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی۔

میرا نام للت ہے!"

متحیر سندرتا کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی: "ارے آپ یہ ہیں! مائی ڈرڈ! میں آپ کو نہ جانے کیا سمجھتی تھی! کس قدر حیرت! میرا تو سر چکرا رہا ہے! اُف! بہر حال فرمائیے کیا حال ہے۔ بیٹھئے بڑی نوازش ہے آپ کی۔ مجھے آپ کی آواز ـــــ"

"میں کس لائق ہوں!" پسند اناؤنسر نے اپنی سنہری آواز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ہاں جو ایک لمبے اناؤنسر ہیں، اُن کا کیا نام ہے، ذرا موٹی سی آواز ہے، جن کی، دیکھو اس وقت میں اُن کا نام کیسا بھول رہی ہوں، میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں، اُنہیں کسی روز میرے پاس بھیجئے گا۔"

"وہ آپ کو جانتے ہیں کیا؟"

"وہی تو مجھے جانتے ہیں! ـــ ہاں ـــ ہاں" سندرتا کچھ گھبرائی گھبرائی کھوئی کھوئی سی تھی ـــ "آپ کیا تناول فرمائیں گے؟"

"میں تو ابھی کافی پی کر آ رہا ہوں کھانا کھانے کی اچھا نہیں معلوم ہوتی۔"

"کچھ ایسا ہی میرا بھی حال ہے۔ نہ جانے کیوں بیٹھے بیٹھے کچھ دل سا گھبرانے لگا۔ آئیے چلئے قریب ہی کافی ہاؤس ہے، ایک ایک پیالی۔"

"مگر ـــ مگر آپ تو شاید کافی سے نفرت کرتی ہیں؟"

"لیکن کبھی کبھی تسکین قلب کیلئے کافی اچھا کام کرتی ہے"

"جی!" پستہ قدانا ڈولنسر نے اس خوش الحانی کے ساتھ کہا کہ تازہ پان کی ایک سرخ آبشارِ "نیاگرا" اُس کے نقرہ انداز لبوں سے مچل کر میز پر رواں ہو گئی۔

سندرتا کا دل خون ہو گیا۔
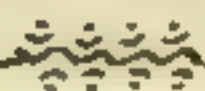
میرے جیون کا اندھیارا

یہ کہانی ہے ایک اندھیارے جیون کی، ایک پُرشور طوفانی زندگی کی جس میں لطف و انبساط کی گھڑیاں چند اور مصائب و آلامِ حیات کے دَور اَن گنت ہیں۔ میں ایک معزز بابو کے ہاں پیدا ہوئی تھی، وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور میں اُن کی اکیلی لڑکی تھی۔ نازو نعم میں پلی تھی، کیونکہ میری ماتا کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا تھا اور میرے پتا کے لئے سوائے میرے کوئی اور چیز نہ تھی جس پر وہ اپنی توجہ، دولت اور جان نثار کر سکتے۔ میری تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے عیش و آرام ایسے وسیع پیمانے پر ہوئے کہ مجھ سے امیر لڑکیوں کو بھی میسّر نہ آئے ہونگے۔ میرا پورا نام سرد بالا تھا مگر پتا جی مجھے سَرا کے رس بھرے نام سے پکارتے تھے۔

دن کے بعد دن گذرتے گئے اور میں ہوشیار ہو گئی۔ ایک شام جبکہ سخت آندھی اور بارش کے طوفان نے تمام کائنات کو کپکپا رکھا تھا میرے پتا جی نڈھال گھر واپس آئے۔ اُن کے چہرے پر مایوسی کے آثار پائے جاتے تھے اور میں اُداس دیکھ کر اُن کے قریب گئی۔ دیکھا اُن کے چہرے پر آنکھوں سے ڈھلکے ہوئے چند موتی بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ ماجرا

دیکھکر گھبرا گئی کیونکہ میرے پتاجی ہمیشہ خوش رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ کبھی اُن کو اداس اور متفکر نہ دیکھا تھا۔ ہر وقت ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے رہتے تھے۔ آج کی حالت دیکھکر میں گھبرا گئی اور پتاجی سے لپٹ کر پوچھا "پتاجی کیا ہوا میرے اچھے پتاجی آپ پریشان کیوں ہیں؟؟"

پتاجی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا "نادان لڑکی میرے ارادوں کی دُنیا خاک میں مل گئی ہے۔ جتنے اُونچے اُونچے پربت تیری زندگی اور آرام کے بنائے تھے سب ختم ہو گئے۔ میرا روپیہ جس بینک میں تھا، تجھے معلوم ہے، میری بیٹی، میری زندگی کا سہارا۔ ساری کٹھن زندگی کا جمع کیا ہوا روپیہ سب اسی بینک میں تھا وہ فیل ہو گیا۔ پیاری سرو میں بالکل بھوکا ہو گیا ہوں۔ ایک کوڑی بھی پاس نہیں ہے۔ تجھے اچھے گھر بیاہنے اور بڑا جہیز دینے کی اور زندگی کے آراموں کے جو جو نقشے میں نے بنائے تھے وہ سب مٹ گئے۔"

یہ کہہ کر پتاجی سسکیاں لینے لگے۔ میں نے اُنہیں دلاسا دیا۔ اور وہ طوفان کی رات جس میں میں نے اپنے باپ کی مالی تباہی کا حال دیکھا رو رو کر گذار دی۔

میرے پتاجی کی صحت اس صدمہ کی وجہ سے خراب رہنے لگی۔ میرے سمجھانے اور دلاسا دینے کے باوجود اُن کی کوئی ڈھارس نہ بندھی تھی۔ میں نے دیکھا وہ جلد بوڑھے ہونے شروع ہو گئے۔ میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آخر ایک دن وہی ہوا جو ہونا تھا۔ شام کو دفتر کا وقت

ختم ہونے سے پہلے دو آدمی پتاجی کو گودی میں لئے ہوئے مکان پر لیکر آئے۔ معلوم ہوا کہ یکایک اُن پر غشی کا دورہ پڑا اور وہ کُرسی پر سے دھم سے گر پڑے۔ ڈاکٹر بلوایا گیا۔ مگر ڈاکٹر نے دیکھکر مایوسی کا اظہار کیا اور دو ہی دن میں وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

موت اور تباہی انسان کے کس قدر قریب رہ کر چکّر لگاتی ہوئی گذر جاتی ہے اس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

اگرچہ ماما کے گھر مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی مگر مامی عجیب طبیعت کی عورت تھیں۔ ماما اگرچہ میری خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے تھے مگر پتاجی کے گھر کا سا آرام کہاں۔ اوّل تو ماماجی کا خود کنبہ بہت تھا دوسرے آمدنی معمولی۔ چھ مہینے تک تو میری خاصی آؤ بھگت ہوتی رہی۔ مگر اسکے بعد شادی تک ماما کے گھر میں جو میری درگت ہوئی خدا دشمن پر بھی وہ بپتا نہ ڈالے۔ مامی نے مجھے ایک فضول بوجھ سمجھا اور روز ماما سے لڑنے جھگڑنے لگیں جس کی کچھ نہ کچھ وجہ مجھ سے متعلق ہوتی تھی۔

میں اب چودہ سال کی ہو چکی تھی، اور شادی کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ ماماجی کو بھی فکر تھی۔ مگر جب کوئی بھی لڑکا جہیز میں روپیہ لئے بغیر مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ میرے ماما خود ایک غریب آدمی تھے اور میری شادی میں جہیز دے ہی کیا سکتے تھے اور بہت پریشان تھے اور کئی بار گھر میں اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک لڑکا خوش قسمتی سے ایسا بھی مل گیا جو باوجود امیر ہونے کے مجھ سے

شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ خواہ لڑکی جہیز میں ایک پیسہ نہ لائے مگر خوبصورت اور خوب سیرت ہو۔ میرے ماما اس رشتہ کے لئے بالکل تیار ہوگئے۔

ہوتے ہوتے مجھے بھی خبر ملی جب میں نے یہ سُنا کہ کوئی لڑکا دُنیا میں ایسا بھی موجود ہے جو مجھ ابھاگن کو بغیر جہیز لئے اپنی بیوی بنانے کے لئے آمادہ ہے تو دل ہی دل میں میری آتما نے کہا۔

"ہے دیوتا" جو میرے حال پر اتنا مہربان ہے تو کیسا ہوگا۔ میرے ساتھ کیسا سلوک کریگا۔ میں کس مُنہ سے اس بھگوان کی تعریف کروں جس نے میرے دیوتا کو ایسا نرم دل دیا ہے"

میری شادی اس لڑکے سے ہوگئی جو ایک زمیندار تھا خوشحال اور نئے خیالات کا طرفدار۔ نوجوان۔

جب سُسرال میں میں نے قدم رکھا تو سب لوگ میری خوبصورتی کو سراہنے لگے۔ ساس نے کہا یہ بہو بہت خوش نصیب اور بھاگیہ ودھی۔ جس نے دیکھا میری خوش نصیبی کی خوشخبری دی!

میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اور اب میں نے محسوس کیا کہ مسرت اور شادمانی بھی دُنیا میں کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس ہی زمانے میں بسنت آئی، رت والی بسنت، کائنات کا ہر ایک ذرہ جوش اور نمو کی آبداری سے چمک رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک طلسمی سرور و مسرت کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔۔۔ نیلا آسمان، ہرے بھرے درخت، سوندھی

زمین، غرض ہر ایک چیز میں ایک نشاط اور سرمستی و جوش کا مدّ بھرا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میری زندگی کا سہارا یعنی میرا خاوند دل و جان سے مجھے چاہتا تھا۔ اور میں اپنے دیوتا کی پرستش کی سرخوشی میں مسرور اور بے حال تھی۔ اس لئے کائنات کی ہر چیز مستی کی انگڑائیاں لیتی مسرت سے ناچتی تھی، اور شادمانی اور سکون و راحت کے گیت الاپتی دکھائی دیتی تھی۔

ہم ایک بہت بڑے مکان میں رہتے تھے جس میں کئی کرایہ دار آباد تھے جن میں اچھے لوگ بھی تھے اور بُرے لوگ بھی، جیسا کہ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ اچھے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے مجھے بھی ایک تجربہ ہوا جس کا بیان مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت مَیں نہا کر اپنے مکان کی چھت پر بال کھول کر سکھا رہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی کہ یکایک میری نظر ایک لڑکے پر پڑی جو مجھے برابر کے مکان سے گھور رہا تھا۔ لڑکا بیماری کی وجہ سے زرد رُو اور بہت لاغر تھا۔ وہ اس قدر بدنظر تھا کہ برابر میری طرف گھورے جاتا تھا۔ میں اس کی یہ بات دیکھ کر نیچے اُتر آئی۔ لیکن اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جب کبھی میں کوٹھے پر چڑھتی وہ زرد رُو بیمار لڑکا مجھے تاکنے کے لئے آموجود ہوتا۔ مجھے یہ بات از حد ناگوار معلوم ہوئی۔ اور میں نے اُوپر جانا چھوڑ دیا۔ مگر ایک اور طرف سے یورش ہوئی۔

ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک طرف کا بازار تھا۔ اس سڑک پر میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف تک رہے ہیں میں نے کھڑکی بند کر دی اور اس بات کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسرے روز جونہی میں نے کھڑکی کھولی کچھ خوش فکرے لوگوں کا پھر مجمع دیکھا۔ یہ لوگ کھڑکی کی طرف برابر دیکھے جاتے تھے۔ اور میرے اس بات سے ایسی آگ سی لگتی تھی کہ کیا بیان کروں۔ ایک بار تو ایک نوجوان اس دریچے کی طرف منہ کئے اندھا دھند گزر رہا تھا کہ ایک چھکڑے سے ٹکراتے اور مرتے مرتے بچا۔ مگر لوگوں کی یہ بدحواسی کہ میرے کمرے کو ٹکٹکی باندھکر دیکھیں اس واقعہ سے بھی کم نہ ہوئی۔ میں نے حالات کی یہ رفتار دیکھکر سب کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازہ بند کر دیا۔ چار روز تک بند کمرے میں رہی۔

مگر ایک روز میرے دیوتا نے کہا۔ "آخر کھڑکیاں کیوں بند کر دی ہیں۔ کیا ہمیں مار ڈالنے کا خیال ہے۔ صاف ہوا آنے دو۔"

میں ان سے بھلا کیا کہتی۔ بہت جز بز ہو کر کھڑکیاں پھر کھول دیں۔

ہماری بلڈنگ کے ایک حصّہ میں ایک بابو ونود نام کے رہا کرتے تھے۔ جو میرے پتی کے دُور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ میری ساس اور گھر کے اور لوگ بلکہ بستی کے سب ہی آدمی، خاصکر عورتیں اس شخص کو نفرت کی نگاہ سے نہیں تو بُری نظر سے ضرور دیکھتی تھیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ونود ایک آوارہ مزاج، آوارہ خیال اور بیہودہ زندگی گذارنے والا آدمی تھا۔ مگر میرے پتی سے اس کا گہرا پریم تھا۔ ایک روز وُہ اُن کے ہمراہ ہمارے گھر آیا۔ میں گھونگھٹ کر کے ایک طرف کو ہو بیٹھی۔ وہ بات چیت کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا۔ پھر ایک بار آیا۔ اور اب اس کا آنا ایک معمول ہو گیا۔ اُس نے میرے دھرم پتی سے یہ بھی شکایت کی کہ میں پردہ کیوں کرتی ہوں۔ بولا: "دیکھو دادا میں تمہارے گھر آنا چھوڑ دوں گا اگر اب بھابی نے پردہ کیا"

میرے دھرم پتی نے مجھ سے نرمی سے کہا "تم ونود سے پردہ ناحق کرتی ہو۔ پردہ اُٹھا دو"

اُن کے کہنے سے میں نے گھونگھٹ نکالنا بند کر دیا۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ اس کی نظر بُری ہے۔ اور اس بُری بات سے مجھے سخت نفرت ہوئی بلکہ ایک جلن محسوس ہوئی کہ یہ شخص میرے گھر کیوں آتا ہے۔ میری ساس بھی اس بات کے سخت خلاف تھیں کہ اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا ہو کیونکہ سب اس کی بدنگاہی کو جانتے تھے۔

وہ آتا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ میری طرف اُس کی نظریں بار بار پڑتیں۔ کبھی کبھار وہ ہنسی اور دل لگی کی باتیں بھی کرتا جنہیں سُنکر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ مگر منہ سے اُف نہ کر سکتی۔

جب اُس کے آنے اور میرے پاس بیٹھنے اُٹھنے کا چرچا بستی میں پھیلنے لگا تو مجھے سخت غصّہ آیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ آج پتی دیو

سے اس بارے میں ضرور بات کروں گی۔ وہ آئے تو میں نے کہا کہ "آپ کو معلوم ہے کہ ونود بابو کے یہاں آنے سے لوگ کیا کہتے ہیں۔ تمہیں خیال نہیں کہ وہ کیسا آدمی ہے؟"

پتی دیو بولے: "شرا میں جانتا ہوں وہ کیسا آدمی ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سوسائٹی اس کی بابت بری رائے رکھتی ہے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک میری شرا میری ہے وہ پاکباز رہےگی جب تک نردوش ہے مجھے سماج کے کہنے کی کوئی پروا نہیں؟"

"مگر ایسا کیوں ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ اس لئے کہ ونود ایک بگڑا ہوا آدمی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مخلص دوست میں ہی ہوں۔ اور اگر وہ زیادہ خراب ہونے سے بچ سکتا ہے تو مجھ سے میل جول رکھنے کے سہارے سے۔ میں اس کو اور تباہ اور بدحال نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لئے اس کو اپنے پریم کے چکر میں داخل کر لیا ہے۔ اس کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور میں اس کی ڈھارس اور اس کے جیون کا آخری سہارا ہوں۔ تاکہ وہ زیادہ خرابیوں میں نہ پڑے۔ شرا تم سماج کے کہنے کی پروا نہ کرو۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ ان لفظوں نے میرا دل کس قدر بڑھا دیا۔ میرا شوہر جب مجھ پر اپنے پورے بھروسہ کا اظہار کرتا ہے تو پھر مجھے کیا ڈر ہے۔ میں اس خیال سے مست رہنے لگی اور دنیا کے کہنے سننے

سے بے خبر ہو گئی۔ ونود آتا جاتا رہا۔ مجھے اپنے پتی کی سیوا اور اُن کے پریم بھرے سلوک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی اور بات کا دھیان کرتی۔

سال میں دو تین مرتبہ میرے پتی دیو کو دیہات میں جا کر روپیہ جمع کرنا ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک زمیندار تھے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ گاؤں چلے گئے اور یہ خیال تھا کہ دو ڈھائی مہینے تک زمینداری میں رہیں گے۔

ایک رات جب کہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، بارش شروع ہو گئی۔ میں چھت پر تھی اس لئے نیچے اتر آئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ میرے بستر پر کوئی شخص چھپا بیٹھا ہے۔ میں یہ سمجھی کہ چونکہ سیف بکس میرے ہی کمرے میں ہے، ضرور کوئی چور آ گیا۔ کچھ ڈری۔ مگر پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ دیئے کی بتی تھوڑی اونچی کی۔ مگر دیکھا کہ سیف بکس بالکل محفوظ ایک طرف رکھا ہے۔ میں اپنی حیرانی کو ابھی پوری طرح محسوس بھی نہ کرنے پائی تھی کہ یکایک کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں پہچان گئی۔ یہ ونود تھا۔ وہ جھپٹ کر میری طرف بڑھا۔

میں نے کہا "تم یہاں کیسے؟ تمہارے دادا تو یہاں نہیں ہیں۔ تم ابھی چلے جاؤ۔"

ونود نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بری نیت سے میری طرف بڑھا۔ میں نے پھر چلا کر کہا کہ "تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔

ورنہ اور شور مچا کر سب گھر والوں کو بلالوں گی۔"

مگر اس کی دیوانگی بڑھتی ہی گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ شخص مجھے بے عزت کرنا چاہتا ہے تو میں نے بھی مقابلے کی ٹھانی، اتفاق سے میرا ہاتھ دیوار کے سہارے لٹکی ہوئی ایک کٹاری پر پڑا جو میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اُسے قبضہ میں کر کے ونود کو دھمکایا۔ مگر وہ میرے جسم کے قریب آگیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ صرف اتنا یاد ہے کہ چکر آیا تھا۔ جب صبح کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں خون میں تر بتر ہوں، کٹاری میرے پاس پڑی ہے اور ونود بھی خون میں لتھڑا ہوا مُردہ میرے پاس پڑا ہے۔

میں حوالات بھیج دی گئی۔ سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے تھے، کیونکہ میں نے نر ہتیا کی تھی۔ ساس وغیرہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ مگر مجھے یہ بھروسہ تھا کہ جب بھی پتی دیو کو خبر لگے گی وہ ضرور میری مدد کو دوڑیں گے۔ مگر میں سوا مہینہ تک حوالات میں رہی لیکن انہیں خبر نہیں ہوئی۔ عدالت میں میں نے صاف صاف بیان دئے اور لائق جج نے مجھے معصوم و بیگناہ قرار دیکر بری کر دیا۔

اب میں اپنے گھر لوٹی تو دیکھا کہ گھر بند ہے۔ نوکرانی باہر بیٹھی ہے۔ اس سے پوچھا: "سب کہاں گئے؟"

وہ بولی کہ: "تمہاری ساس اپنے میکے چلی گئی۔ تم سے سب ناراض ہیں۔"

میں نے کہا "کمرہ کھولو"
وہ بولی "کنجیاں میرے پاس نہیں ہیں"
میں پریشان تھی کہ اب کہاں جاؤں. آخر ایک نوکروں کی کوٹھڑی میں جو ہمارے مکان کے ساتھ ہی تھی رہنے لگی.

ایک دن مکان میں کچھ آوازیں آنی شروع ہوئیں. میں نے سوچا وہ زمینداری سے واپس آگئے ہوں گے. اب انہیں سارا حال معلوم ہوگا تو وہ مجھے لینے کے لئے ضرور آئیں گے. مگر افسوس وہ نہ آئے. میں بڑی سوچتی رہی کہ کیا وفا کا یہی انجام ہے. میں نے جن پر بھروسہ کیا کیا مجھے وہ اتنے جلد بھول گئے اور اس بُری طرح بھول گئے. میں اندر جانا چاہتی تھی کہ نوکرانی نے روک دیا. اس نے کہا "نر ہتیا کرنے والی عورت اس دہلیز کے پار نہیں جاسکتی"

میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ کون آیا ہے؟"
اس نے بتایا کہ میری ساس اور بابو وغیرہ آگئے ہیں. میں نے کہا ان سے کہو کہ میں بلاتی ہوں" نوکرانی نے جاکر کہدیا. جواب میں بابو نے ایک چِٹ لکھی جو یہ تھی:-

"مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے مگر کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا. دُنیا کے سامنے بے بس ہوں. میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا لیکن تمہیں اپنے گھر بھی نہیں بُلا سکتا. تم ہی بتاؤ مَیں کیا کروں؟"

میں نے یہ پڑھا تو سر چکرانے لگا۔ اپنے پتی دیو کی اس بے رخی پر افسوس بھی کیا اور دل ہی دل میں کہا: پوچھتے ہیں کیا کروں۔ جب مرد ہو کر میرے لئے کچھ کام نہیں کر سکتے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں کہ کیا کروں۔ تم تو مرد ہو اور عورت کمزور ہے پھر بھی اسی سے پوچھتے ہو کیا کروں! میں تو طوفان میں گھری ہوئی ہوں تم ہی مجھے بتاؤ کیا کروں۔ میں نے تو تم پر بھروسہ کیا تھا اور تم مجھے سماج میں پاپی کر کے چھوڑ گئے! میں تم سے پوچھتی ہوں کیا کروں؟"